الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

انتقام لینے سے پہلے سوچ لو کہ —
انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا

ستمبر ۱۹۸۳ ◻ قیمت فی پرچہ - تین رُوپے ◻ شمارہ ۸۲

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

ستمبر ۱۹۸۳
شمارہ ۸۲

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

AL-RISALA

Islamic Monthly

الرسالہ کا انگریزی اڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کے انگریزی اڈیشن کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ اس کا پہلا شمارہ انشاء اللہ جلد ہی شائع ہوگا۔ نمونہ مفت طلب فرمائیں۔ انگریزی الرسالہ کے ٹائٹل کا نمونہ زیر نظر شمارہ کے آخری صفحہ پر دیا جارہا ہے۔

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

اختلاف کا سبب دنیا

ہر قسم کے جھگڑوں کے پیدا ہونے کا واحد سبب دنیا کو اہمیت دینا ہے۔ لوگ اگر آخرت کو اہمیت دینے لگیں تو کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو اور اگر پیدا ہو تو فوراً ختم ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کا امیر کون ہو۔ یہ بے حد اختلافی مسئلہ تھا۔ مہاجرین کا خیال تھا کہ امیر کسی مہاجر کو ہونا چاہئے۔ انصار کہتے تھے کہ انصار میں سے کسی شخص کو امیر بنایا جائے۔ اس کے بعد ذی ہوش افراد نے لوگوں کے سامنے یہ بات رکھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخر وقت میں حضرت ابوبکر کو نماز کا امام بنایا تھا۔ نماز کی امامت انتظام دین کا معاملہ ہے، اور امارت اور خلافت انتظام دنیا کا معاملہ۔ پھر اللہ کے رسول نے جس شخص کو انتظام دین کے لئے اہل سمجھا ہو وہ بدرجۂ اولیٰ انتظام دنیا کا اہل ہوگا۔

اس سلسلے میں یہاں دو روایتیں نقل جاتی ہیں:

اخرج النسائی عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ لما قبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت الانصار منا امیر ومنکم امیر فاتاهم عمر رضی اللہ عنہ فقال الستم تعلمون ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد امر ابا بکر ان یصلی بالناس فایکم تطیب نفسه ان یتقدم ابابکر۔ فقالوا نعوذ باللہ ان نتقدم ابابکر (جمع الفوائد)

حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو انصار نے کہا کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک امیر تم میں سے ہو۔ تو حضرت عمر ان کے پاس آئے اور کہا کہ کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو حکم دیا تھا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ پھر تم میں سے کون یہ پسند کرے گا کہ وہ ابوبکر کے آگے بڑھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس بات سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ ہم ابوبکر کے آگے بڑھیں۔

عن علی رضی اللہ عنہ قال لقد امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ابابکر ان یصلی بالناس و انی لشاهد وما انا غائب وما بی مرض فرضینا لدنیانا مارضی به النبی صلی اللہ علیہ وسلم لدیننا (کنز العمال)

حضرت علی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ میں اس وقت موجود تھا میں غائب نہیں تھا۔ مجھے کوئی بیماری بھی نہیں تھی۔ لہٰذا ہم اپنی دنیا کے لئے اس شخص پر راضی ہیں جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے دین کے لئے راضی ہوگئے تھے۔

ناقابل معافی

حدیث میں آیا ہے کہ ایک لڑائی میں ایک مسلمان کے سر پر زخم آ گیا۔ وہ زخمی حالت میں تھا کہ اگلی صبح کو اسے غسل کی حاجت ہوئی۔ پانی سر پر ڈالنا سخت مہلک تھا۔ اس نے دوسرے مسلمان ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ پانی کی موجودگی میں ہم تیرے لئے کوئی گنجائش نہیں پاتے۔

مسلمان نے جب دیکھا کہ دوسری کوئی راہ نہیں ہے تو اسی حالت میں اس نے غسل کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی حالت نازک ہوگئی اور وہ مرگیا۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ کو بے حد دکھ ہوا۔ آپ نے فرمایا: قتلوہ قتلھم اللہ (انھوں نے اس کو ہلاک کر ڈالا، خدا انھیں ہلاک کرے)

مذکورہ مسئلہ واضح طور پر اجتہادی تھا۔ اس کے باوجود آپ نے ان کے بارہ میں اتنے سخت الفاظ فرمائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجتہاد میں غلطی کی معافی کی بھی ایک حد ہے۔ عام حالات میں اجتہادی خطا پر پکڑ نہیں ہے۔ مگر جب معاملہ زیادہ نازک ہو جب ایسا مسئلہ درپیش ہو جس سے آدمی کی زندگی اور موت وابستہ ہو جائے تو ایسی حالت میں اجتہادی رائے پیش کرنے سے بچنا چاہئے۔ ایسے موقع پر اجتہادی رائے دینا اور اس پر اصرار کرنا بے حسی کی بات ہے اور بے حسی ایمان کی موت کی نشانی ہوتی ہے۔

اوپر کی حدیث صرف ایک ایسی اجتہادی غلطی سے متعلق ہے جس کا نقصان انفرادی سطح پر ظاہر ہوا ہو۔ پھر یہی بات مزید شدت کے ساتھ ان واقعات کے بارہ میں صادق آتی ہے جب کہ کوئی قائد ملّت کو ایسی اجتہادی رائے پر دوڑا دے جس کا نتیجہ ملّت کے لئے اجتماعی ہلاکت کی صورت میں برآمد ہوا ہو۔

"غسل کے وقت آدمی کا رخ قبلہ کی طرف ہو یا نہ ہو" اس مسئلہ میں مفتی اگر غلط فتویٰ دیدے تو اس میں کسی کے لئے جان و مال کے نقصان کا اندیشہ نہیں۔ مگر ایک شخص جو شدید طور پر زخمی ہے وہ غسل کرے یا نہ کرے، اس معاملہ میں غلط فتویٰ سے آدمی کی جان خطرہ میں پڑجاتی ہے۔ اس لئے دونوں قسم کے مسائل پر غلطی کا معاملہ یکساں نہیں ہے۔ پہلی قسم کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے جس میں اجتہادی غلطی پر بھی آدمی کو حسن نیت کا ثواب مل سکتا ہے۔ مگر دوسری قسم کے مسئلہ میں اجتہادی غلطی کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ نازک معاملات جن کے ساتھ فرد اور قوم کی قسمتیں ہوں، ان میں مفتی کے لئے لازم ہے کہ وہ آخر وقت تک چپ رہے۔ اور اگر بولے تو اس وقت بولے جب کہ فی الواقع وہ خدا کے سامنے اس کے لئے بری الذمہ ہو چکا ہو۔

اختلاف دشمن کا ہتھیار

اسرائیل کے سابق وزیر جنگ موشے دایان (۱۹۸۱-۱۹۱۵) نے اپنی خود نوشت سوانح عمری (The Story of my life) میں لکھا تھا کہ غیر متحد عرب جو ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں ، اسرائیل کے لئے کوئی خطرہ نہیں بن سکتے۔

The Arabs, disunited and at odds with one another over every issue, big and small, present no threat.

اب ۱۹۸۳ کے نصف آخر میں خود فلسطینی تنظیم (الفتح) میں اختلاف اور باہمی ٹکراؤ شروع ہو گیا ہے۔ لبنان میں فلسطینیوں کی ناکامی کے بعد ان کے ایک بڑے طبقہ میں یاسر عرفات کی قیادت پر اعتماد اٹھ گیا ہے۔ وہ ابوموسیٰ کے جھنڈے کے نیچے یاسر عرفات کو قیادت سے ہٹانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف یاسر عرفات قیادت کے منصب سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس طرح فلسطینیوں میں دو گروہ بن گئے ہیں اور وہ آپس میں خوں ریز تصادم میں مصروف ہیں۔

ان حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے اخبار واشنگٹن پوسٹ نے اسرائیل کے وزیر خارجہ نیز اک شامر (Yitzhak Shamir) کا قول نقل کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں یہ کہوں گا کہ یہ اسرائیل کے حق میں اچھا ہے کہ فلسطینی تنظیم کے درمیان اندرونی جھگڑے، علیحدگی اور تقسیم پائی جا رہی ہے:

I must say that it is good for Israel that there are domestic quarraels, breakups and divisions within the organization of the PLO.

واشنگٹن پوسٹ نے مزید نقل کیا ہے کہ اسرائیل کے محکمہ جنگ کے ایک افسر نے کہا کہ اسرائیل میں یہ یقین کیا جاتا ہے کہ لبنان کے شمالی اور مشرقی حصہ میں یاسر عرفات کے خلاف بڑھتی ہوئی بغاوت کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ جنوبی لبنان میں اسرائیلی فوجیوں پر فلسطینی حملوں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ اسرائیل کے محکمہ جنگ کے دوسرے افسر نے اس کے جواب میں کہا:

They are busy among themselves, and that is good for us.

وہ لوگ خود اپنے درمیان مصروف ہیں اور یہ ہمارے لئے بہت اچھا ہے (گارجین، ۳ جولائی ۱۹۸۳)

آپس میں لڑنا گویا اپنا دشمن آپ بننا ہے۔ یہ اس تخریبی کام کو خود اپنے ہاتھوں انجام دینا ہے جس کو دشمن اپنے ہاتھوں سے انجام دینا چاہتا ہے۔

تاریخ سبق دیتی ہے

مسلم دنیا پر تاتاریوں کا حملہ (۶۱۷ھ) اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ بھیانک واقعہ تھا۔ عجیب بات ہے کہ یہ حملہ عین اس زمانہ میں ہوا جب کہ مسلمانوں نے یورپ کی صلیبی اقوام پر فتح (۵۸۷ھ) حاصل کی تھی اور شاہ مصر صلاح الدین ایوبی کے تحت اپنی فوجی برتری کی شاندار روایات قائم کی تھیں۔ صلاح الدین ایوبی کی وفات (۵۸۹ھ) کے صرف ۲۵ سال بعد تاتاری قبائل کو کیسے یہ جرأت ہوئی کہ وہ مسلم سلطنت پر حملہ کردیں۔

اس کا راز مسلمانوں کا آپس کا اختلاف تھا۔ اس زمانہ میں بغداد میں خلیفہ ناصرلدین اللہ کی حکومت تھی۔ خراسان میں خوارزم شاہ حکومت کرتا تھا۔ یہ دونوں مسلمان تھے۔ خوارزم شاہ اگرچہ ایک آزاد حکمراں تھا۔ تاہم آئینی طور پر وہ خلیفہ بغداد کے ماتحت تھا اور اس کے ملک میں خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ خوارزم شاہ کے ذہن میں بغاوت کے خیالات پیدا ہوئے۔ اس نے ۶۱۵ھ میں خلیفہ بغداد کا خطبہ پڑھنا بند کردیا اور اپنی سلطنت کو دریائے دجلہ تک وسیع کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔

خلیفہ ناصرلدین اللہ اس پر برہم ہوگیا۔ وہ اس وقت کوئی فوجی کارروائی کرنے کے موقف میں نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی ہوشیاری کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ہم عصر مورخ کامل بن اثیر نے لکھا ہے کہ اس نے یہ تدبیر کی کہ چین کی سرحد پر بسنے والے تاتاریوں کو خوارزم شاہ کے خلاف اکسادیا۔ یہ وحشی قبائل چنگیز خاں کی قیادت میں اپنے علاقے سے نکلے اور خوارزم شاہ کی سلطنت (خراسان) میں گھس آئے۔ خوارزم شاہ نے مقابلہ میں شکست کھائی۔ وہ بھاگ کر طبرستان چلا گیا جہاں ۶۱۷ھ میں کس مپرسی کی حالت میں مرگیا۔

خراسان اور دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنے بعد تاتاریوں کا حوصلہ بڑھا۔ اس کے بعد وہ بغداد کی طرف بڑھے اور خود خلیفہ ناصرلدین اللہ کی سلطنت پر حملہ کردیا۔ تاتاریوں کو اگرچہ فوری طور پر بغداد پر قبضہ کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ تاہم سلطنت بغداد پر تاتاریوں کے مسلسل حملہ نے خلیفہ ناصرلدین اللہ کو اتنا پریشان کیا کہ اس کو سخت قسم کی پیچش ہوگئی۔ جو مدت تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ خلیفہ نہایت کمزور ہوگیا اور اس کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔ اسی اندھے پن کی حالت میں ۶۲۲ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔

دو مسلم قائدین جو ایک دوسرے کو قبر میں پہنچانا چاہتے تھے خود قبر میں پہونچ گئے۔ خوارزم شاہ خطبہ کی موقوفی کے دو سال بعد اور ناصرلدین اللہ حملہ کروانے کے چار سال بعد۔

تعصّب کی حد

جار اللہ زمخشری (۵۳۸ - ۴۶۷ھ) ایک معتزلی عالم تھے۔ معتزلہ سے عام مسلمانوں کا اختلاف اتنا بڑھا کہ وہ ان کی کتابوں کے دشمن ہوگئے۔ فرقہ معتزلہ میں کثرت سے علمار تھے اور انھوں نے بہت بڑی تعداد میں کتابیں لکھیں مگر ان کی تمام کتابیں جلادی گئیں۔ اس میں صرف ایک استثنار ہے اور وہ زمخشری کا ہے۔ زمخشری اگرچہ معروف معتزلی تھا۔ تاہم اس کی دو کتابیں المفصل (نحو) اور الکشاف (تفسیر قرآن) آج بھی موجود ہیں اور علمائے اہل سنت کے درمیان بدستور مقبول ہیں۔ اور علمی مرجع کے طور پر کام دیتی ہیں۔

اسی طرح ابن منظور (۷۱۱ - ۶۳۰ھ) ایک شیعہ تھا۔ شیعی گروہ اور اہل سنّت کے درمیان ایک ہزار سال سے زبردست اختلافات موجود ہیں۔ آج تک ان میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ شیعہ علمار کی کتابیں صرف شیعہ فرقہ کے درمیان رائج ہیں۔ سنّی علمار ان کو دیکھتے ہیں تو تردید کے لئے نہ کہ استفادہ کے لئے۔ مگر یہاں بھی بعض استثنار ہیں۔ مثلاً ابن منظور کی کتاب لسان العرب (لغت) کو علمار اہل سنّت کے درمیان خصوصی مقام حاصل ہے اور اہل علم عام طور پر اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

زمخشری کا اعتزال اور ابن منظور کی شیعیت ان کی کتابوں کو علمار اہل سنّت کے درمیان مقبول بنانے میں حارج نہ ہوسکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بعض اہم موضوعات پر ایسی قیمتی کتابیں لکھیں جن کے مثل اس خاص موضوع پر کوئی دوسری کتاب موجود نہ تھی۔ ان کی مقبولیت ان کے امتیازی عمل کی قیمت ہے۔ بعض آدمی کا کام اتنا بلند ہوجاتا ہے کہ اعتقادی اختلافات ان کو قبول کرنے میں حارج نہیں ہوتے۔

زندگی کے معاملات کو سمجھنے کے لئے جن لوگوں کو صرف "تعصّب" کا لفظ معلوم ہے انھیں ایک اور حقیقت کی خبر نہیں۔ وہ یہ کہ تعصب کے عمل کی بھی ایک حد ہے۔ ایک حد کے بعد تعصب غیر موثر ہوجاتا ہے یہ حد ہے "امتیاز"۔

اگر آپ اپنی کارکردگی کو عام معیار سے بڑھا کر امتیاز کے درجہ میں پہنچا دیں تو تعصّب کی دیواریں اپنے آپ گر جاتی ہیں۔ اس کے بعد آپ کا دشمن بھی آپ کا اتنا ہی قدرداں بن جاتا ہے جتنا آپ کا دوست۔

کیسی عجیب غفلت

مولانا عبیداللہ سندھی (۱۹۴۴-۱۸۷۲) ایک نومسلم تھے۔ وہ پنجاب کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن سے غیر معمولی ذہین تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنا نام "عبید اللہ" اس لئے رکھا کہ وہ اس سلسلے میں سب سے پہلے جس کتاب سے متاثر ہوئے وہ "تحفۃ الہند" تھی جس کے مصنف کا نام "عبیداللہ" ہے۔

اس کتاب میں اسلام کا تقابل دوسرے مذاہب سے کیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ کتاب پڑھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سکھ مذہب اور ہندو دھرم سے غیر مطمئن ہو گئے۔ اس کتاب نے ان کے اندر اسلام کی طرف ابتدائی رجحان پیدا کر دیا۔ تاہم ابھی وہ قطعی فیصلہ نہیں کر سکے تھے۔ بعد کو انھوں نے بتایا کہ "میں سوچتا تھا کہ اسلام بت پرستی کے خلاف ہے۔ مگر مسلمان اپنے بزرگوں کی قبروں کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں وہ بھی تو ایک طرح کی بت پرستی ہے"۔ یہ سوال ان کے لئے اسلام قبول کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

اپنے دل کی یہ کھٹک انھوں نے کچھ مسلمانوں سے بیان کی۔ چنانچہ ایک مسلمان نے انھیں شاہ محمد اسمٰعیل شہید کی کتاب "تقویۃ الایمان" دی اور اس کو پڑھنے کا مشورہ دیا۔ اس کتاب کا موضوع شرک کی مختلف صورتوں کی تردید اور توحید کا اثبات ہے۔ انھوں نے جب اس کتاب کو پڑھا تو ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اسلام توحید خالص کا دین ہے۔ انھوں نے جانا کہ مسلمانوں کی قبر پرستی مسلمانوں کے اپنے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ ورنہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ قبر پرستی کا بھی ویسا ہی مخالف ہے جیسا وہ بت پرستی کا مخالف ہے۔

ان دو کتابوں کے مطالعہ کے بعد ان کا نظریاتی سفر بڑی حد تک پورا ہو چکا تھا۔ تاہم آبائی مذہب کو چھوڑ کر نئے مذہب کی طرف بڑھنے کے لئے جس طاقت ور محرک کی ضرورت ہے وہ ابھی ان کے اندر پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ کام ایک اور کتاب کے مطالعہ سے انجام پا گیا۔ یہ "احوال الآخرت" تھی۔ اس کتاب میں قیامت کی ہولناکی اور جنت دوزخ کی باتیں درج ہیں۔ پچھلی کتابوں کے مطالعہ سے اگر ان کا دماغ ہلا تھا تو آخری کتاب کے مطالعہ سے ان کا دل ہل گیا اور انھوں نے اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔

یہ تینوں کتابیں جن کا ذکر ہوا وہ اردو کتابیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۵۰ سال یا ۱۰۰ سال پہلے کے ہندستان میں یہ ممکن تھا کہ اردو زبان کو غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا جاسکے۔ کیسا عجیب اور کیسا قیمتی امکان تھا جس کو ہمارے تمام اصاغر و اکابر نے بے فائدہ سیاست کی ہنگامہ آرائیوں میں کھو دیا۔ قانون قدرت کے مطابق اس کی سزا ہمیں یہ ملی ہے کہ اب غیر مسلموں میں دین پہنچانے کے لئے ہمیں کئی اجنبی زبانوں میں اسلامی لٹریچر فراہم کرنا ضروری ہوگیا ہے اور اردو زبان کا یہ حال ہوا ہے کہ غیر مسلم تو درکنار اب خود مسلم نسلوں تک بھی اس کے ذریعہ دین کا پیغام پہنچانا ممکن نہیں۔ جو کام پہلے صرف ایک زبان کے ذریعہ ہوسکتا تھا اس کے لئے اب ہم کو کئی زبانیں کی ضرورت ہے۔

آزادی کے بعد ہندستان کے مسلمانوں کی جدوجہد کا کم از کم ایک نمایاں عنوان اردو رہا ہے۔ اردو کے خاتمہ کا مرثیہ پڑھنا ہمارے تمام لیڈروں کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ مگر کوئی یہ نہیں سوچتا کہ جب آزادی ہند سے پہلے ملک کی سب سے زیادہ عام زبان اردو تھی تو آزادی ہند کے بعد وہ یہاں اجنبی کیسے بن گئی۔

زبان ان چیزوں میں سے ہے جس کا تسلسل اگر تاریخ میں ایک بار قائم ہوجائے تو اس کو توڑنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ تسلسل قائم ہونے کے بعد وہ خود اپنے زور پر قائم رہتی ہے۔ اس کے بعد کوئی بہت بڑا اجتماعی بھونچال ہی اس کو توڑ سکتا ہے۔ ورنہ عام حالات میں اس کا تسلسل تاریخ میں جاری رہے گا۔ وہ ختم نہیں ہوسکتا۔

ہندستان میں اردو کے خاتمہ کے واحد ذمہ دار خود مسلمان ہیں۔ مسلمانوں نے اس ملک میں دو قومی سیاست چلائی اور اس کو اس اجتماعی بھونچال تک لے گئے جس کا دوسرا نام تقسیم ہے۔ تقسیم ملک کا بھونچال ہی دراصل وہ واقعہ ہے جس نے اردو کے تسلسل کو ہندستان میں ختم کردیا۔ اگر مسلمانوں کی احمقانہ سیاست سے یہ بھونچال پیش نہ آتا تو ناممکن تھا کہ اس ملک میں اردو کا اس طرح خاتمہ ہوجائے جو آج ہمیں اپنی آنکھوں سے نظر آتا ہے۔

اس کی ایک مثال ہندستان کی فلمی صنعت ہے۔ ہندستانی فلموں کی دنیا میں اردو زبان آج بھی زندہ ہے جب کہ ملک کے بقیہ حصہ میں وہ موت سے دوچار ہورہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "فلم" کی حیثیت ہر ملک میں اور اسی طرح ہندستان میں بھی، ایک جزیرہ کی ہے۔ فلم کی دنیا عام طور پر سیاسیات اور قومی ہنگاموں سے الگ الگ زندہ رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستانی فلموں کے جزیرہ میں اردو آج بھی پہلے کی طرح، زندہ ہے۔ جب کہ بقیہ ملک میں وہ اپنی سابقہ حیثیت کھو چکی ہے۔

غیر علمی طریقہ

فون کریمر اور گولڈزیہر نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے ایک عجیب وغریب موضوع پر بحث کی۔ اور وہ یہ کہ "کیا عجمی لوگ جنت میں عرب عورتوں سے نکاح کریں گے"۔ یہ مستشرقین اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی فتوحات کے پیچھے صرف یہ جذبہ تھا کہ عربوں کی سیادت غیر عرب اقوام پر قائم ہو۔ ان کا یہ جذبہ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ انھیں یہ پسند نہیں آیا کہ جنت میں کوئی عرب خاتون کسی عجمی مسلمان کی بیوی بنے۔

یہ قصہ المبرد نے کتاب الکامل میں نقل کیا ہے۔

جو شخص اس عبارت کو پڑھے گا وہ بادی النظر میں یہی سمجھے گا کہ مسلمانوں میں سے ایک بڑے گروہ نے اس موضوع پر بحث کی۔ اور جن لوگوں نے یہ بحث کی وہ یقیناً فقہاء ہوں گے۔ کیوں کہ یہ موضوع فقہ سے تعلق رکھتا ہے۔

لیکن اگر آپ مستشرق کے بیان کو کافی نہ سمجھیں بلکہ خود اس کے ماخذ کی تحقیق کریں تو آپ پر ایک عجیب انکشاف ہوگا، اب آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ "لوگ"، جنھوں نے اس موضوع پر بحث کی کہ غیر عرب مرد اور عرب عورتوں کے درمیان جنت میں نکاح ہوگا یا نہیں، وہ صرف ایک اعرابی تھا جو بادیہ سے آیا تھا۔ یعنی ایک معمولی شخص نہ کہ کوئی جماعت۔

اصمعی جو لغت کی تحقیق کے سلسلہ میں اہل بادیہ سے خاص دلچسپی لیتا تھا، اس نے ایک اعرابی کو ایسا کہتے ہوئے سنا۔ وہ دوسرے آدمی سے کہہ رہا تھا کہ تمہارا کیا خیال ہے، کیا یہ اعاجم جنت میں عرب عورتوں سے نکاح کریں گے۔ دوسرے آدمی نے جواب دیا: خدا کی قسم ہاں، عمل صالح کے ذریعہ (اتری ھذہ العجم تنکح نساءنا فی الجنۃ۔ فقال اری ذالک واللہ بالعمل الصالح) اس قصہ کو مبرد نے اپنی کتاب میں تفنن کے طور پر نقل کر دیا۔ (الکامل للمبرد، جلد ۲، فصل الموالی عند العرب)

اس قسم کا استدلال واضح طور ایک انفرادی واقعہ کو عمومی بنانا ہے۔ موجودہ زمانہ کے تمام علماء جانتے ہیں کہ کسی واحد واقعہ کو عمومی بنا کر پیش کرنا سراسر غیر علمی طریقہ ہے۔ مگر اسی غیر علمی طریقہ کو انھوں نے اس وقت علمی سمجھ لیا جب کہ اس سے ان کا نام نہاد مقصد حاصل ہو رہا تھا۔

حقیقت حج

اکتوبر ۱۹۸۲ میں فریضۂ حج کے بارہ میں ایک مقالہ بعنوان "حقیقت حج" چھپا تھا۔ اب اس مقالہ کو علاحدہ پمفلٹ کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ قیمت ——— پچھتر پیسے

عبرت ناک

قاضی نذرالاسلام بنگلہ زبان کے مشہور شاعر تھے۔ ٹیگور (۱۹۴۱-۱۸۶۱) کو جب نوبل انعام ملا تو نذرالاسلام نے ان کو مبارک باد کا خط بھیجا۔ اس کے جواب میں ٹیگور نے جو خط لکھا تھا وہ ٹیگور کے مجموعہ مکاتیب میں شامل ہے۔ اس میں ٹیگور نے نذرالاسلام کو لکھا: نوبل انعام کے اصل مستحق تم تھے، میں نہیں۔

نذرالاسلام نہایت پرجوش انقلابی شاعر تھے۔ وہ آزادی کی حمایت میں اور انگریزی استعمار کے خلاف شعلہ بار نظمیں لکھا کرتے تھے۔ اس سے نوجوانوں میں آزادی کے جذبات بھڑکتے تھے۔ چنانچہ انگریزی حکومت نے نذرالاسلام کو گرفتار کرکے رانچی کے جیل میں قید کر دیا۔ وہاں ان کو جس کمرہ میں رکھا گیا وہ قلم، سیاہی اور کاغذ جیسی چیزوں سے بالکل خالی تھا۔ ان کے لئے بظاہر ناممکن بنا دیا گیا کہ وہ کچھ لکھ سکیں۔

قاضی نذرالاسلام کے دماغ میں آزادی کے ترانے ابلتے تھے مگر وہ اپنے قید کے کمرہ میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتے تھے جس سے وہ ان کو لکھ سکیں۔ بالآخر انھوں نے یہ کیا کہ شیو بنانے کے بلیڈ سے اپنی انگلی کو زخمی کیا جس کے نتیجہ میں انگلی سے خون جاری ہو گیا۔ اب انھوں نے اپنی انگلی کو قلم بنایا اور خون کو روشنائی اور پھر جیل کی دیواروں پر آزادی کے اشعار لکھ ڈالے۔

ٰیہی واقعہ ہے جس کے بارے میں جوش ملیح آبادی نے اپنا یہ شعر کہا ہے:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے — کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے زبردست قربانیاں دی ہیں۔ مگر یہ تمام قربانیاں حقیقۃً قوم اور وطن اور سیاست کی راہ میں تھیں۔ اپنے سیاسی جذبات کے اظہار کے لئے انھوں نے اپنے خون کو روشنائی بنا ڈالا۔ اور قومی مقاصد کے حصول کے لئے انھوں نے اپنے جان و مال کو لٹا دیا۔ مگر پوری جدید تاریخ میں کوئی بھی قابل ذکر شخص نہیں ملتا جس نے دعوت کی راہ میں اپنے آپ کو ہلکان کیا ہو۔

مسلمان کا اصل مقصد اقوام عالم تک خدا کے پیغام کو پہنچانا ہے۔ مگر یہی وہ کام ہے جس کو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ چھوڑ رکھا ہے۔ وہ سب کچھ کرتے ہیں مگر اسی ایک کام کو نہیں کرتے۔ اس معاملہ میں ان کی بے شعوری کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے دوسرے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں اور ان کو "دعوت" کا نام دیدیتے ہیں۔ یہی واحد سب سے بڑی کوتاہی ہے جس کی بنا پر مسلمان موجودہ زمانہ میں خدا کی نصرت کے مستحق نہ ہو سکے۔

اظہار دین

هوالذی ارسل رسولہ بالهدی ودین الحق لیظهرہ علی الدین کلہ ولوکرہ المشرکون

اللہ نے اپنا رسول بھیجا ہدایت اور سچا دین لے کر تاکہ اس کو سب دینوں سے اوپر کردے، اگرچہ شرک کرنے والے کتنا ہی ناخوش ہوں۔

یہ آیت قرآن میں تین مقامات پر آئی ہے (التوبہ، الفتح، الصف) اس سے مراد فکری غلبہ ہے نہ کہ اسلام کے تمام قوانین کو نافذ کردینا۔ کیونکہ آیت میں اظہار کا لفظ ہے نہ کہ نفاذ کا۔

اظہار کے لفظ میں ظہور اور غلبہ کا مفہوم ہے۔ قرآن میں ہے واظهرہ اللہ (التحریم ۳) یعنی خدا نے چھپی بات کو ظاہر کردیا۔ فلا یظهر علی غیبہ احدا (الجن ۲۶) یعنی خدا کے غیب پر کوئی مطلع نہیں ہوتا۔ اس لفظ کا دوسرا مفہوم غلبہ ہے۔ قرآن میں ہے یاقوم لکم الملک الیوم ظاهرین فی الارض (غافر ۲۹) یعنی تمہارے پاس اقتدار ہے اور تم زمین میں برتری رکھتے ہو۔ فایدنا الذین آمنوا علی عدوهم فاصبحوا ظاهرین (الصف ۱۴) یہ آیت حضرت مسیح کے پیروؤں کے بارہ میں ہے ان کو یہود پر خدا کی مدد سے غلبہ مل گیا۔ یہ غلبہ کبھی بھی اس معنی میں نہیں تھا کہ حضرت مسیح کی شریعت کے تمام قوانین یہود کے اوپر نافذ ہوگئے ہوں۔ یہ صرف اس معنی میں تھا کہ حضرت مسیح کے بعد جب مسیحی مذہب پھیلا اور بالآخر رومی بادشاہ قسطنطین اعظم مسیحی ہوگیا تو رومن امپائر کے باشندے کثرت سے مسیحی بن گئے۔ اس طرح ہر جگہ مسیحیوں کی اکثریت ہوگئی اور وہ یہودیوں کے اوپر چھاگئے۔

"اظہار" کا لفظ نہ باعتبار لغت نفاذ قانون یا اقامت نظام کے معنی میں ہے اور نہ قرآن میں کسی مقام پر وہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ خود مذکورہ آیت میں لیظهرہ علی الدین (دین پر غالب کردے) فرمایا گیا ہے۔ لیظهرہ علی الناس (لوگوں کے اوپر غالب کردے) نہیں فرمایا گیا۔ اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قوانین انسان کے اوپر نافذ ہوتے ہیں نہ کہ دین یا ادیان کے اوپر۔

خدا کا یہ منصوبہ تھا کہ "مشرکین" نے خدا اور رسول کے نام پر جو خود ساختہ مذاہب بنا رکھے ہیں ان کو مغلوب کرکے دین اسلام کو ان کے اوپر فکری اور تاریخی حیثیت سے غالب کردیا جائے۔ یہ کام پیغمبر اسلام کے ذریعہ مکمل طور پر انجام پایا گیا۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

روپیہ سے راکھ تک

گھنشیام داس برلا (۱۸۹۴-۱۹۸۳) ہندستان کے مشہور ترین صنعت کار تھے۔ ان کی اعلیٰ کامیابی کا راز ان کی بے حد با اصول زندگی تھی۔ انھوں نے ۱۲ سال کی عمر میں معمولی کاروبار سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر وہ عظیم ترقی تک پہنچے آج ان کا خاندان ہندستان کا واحد سب سے بڑا کاروباری خاندان ہے۔

مسٹر برلا کا معمول تھا کہ صبح ۵ بجے اٹھتے اور شام ۹ بجے تک مسلسل کام میں مشغول رہتے۔ ان کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ وہ شراب کے بجائے کافی پیتے تھے۔ دو کھانے کے درمیان پانی کے سوا اور کچھ نہیں لیتے تھے۔ اکثر اپنا کھانا خود اپنے ہاتھ سے پکاتے۔

مسٹر برلا روزانہ صبح کو ٹہلنے کے لئے نکلتے تھے۔ اس معمول میں کوئی فرق نہیں آتا تھا، خواہ وہ ہندستان میں ہوں یا ہندستان کے باہر۔ ۱۱ جون ۱۹۸۳ کو وہ لندن میں تھے۔ وہ حسب معمول صبح کے ناشتہ کے بعد ریجنٹ اسٹریٹ پر ٹہلنے کے لئے نکلے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد انھیں تکلیف محسوس ہوئی۔ انھوں نے اپنے دو مددگاروں کو بتایا جو اس وقت ان کے ساتھ تھے۔ وہ انھیں فوراً گھر واپس لائے۔ گھر آتے ہی وہ بے ہوش ہو گئے۔ اس کے بعد انھیں لندن کے مڈل سکس اسپتال پہنچایا گیا۔ اسپتال میں انھیں تھوڑی دیر کے لئے ہوش آیا۔ وہاں انھوں نے کہا —— ڈاکٹر، مجھے کیا تکلیف ہے۔

What is wrong with me, Doctor ?

ڈاکٹروں نے کہا۔ ہم پانچ منٹ میں معائنہ کر کے بتاتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ ڈاکٹروں کا معائنہ مکمل ہو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ مسٹر برلا کی وصیت تھی کہ جہاں میرا انتقال ہو وہیں میرے آخری مراسم ادا کئے جائیں۔ چنانچہ مسٹر برلا کی لاش کو لندن میں بجلی کے ذریعہ جلا دیا گیا۔ اور ان کی راکھ ہندستان لا کر یہاں کی ندیوں میں بہا دی گئی۔ مسٹر برلا کی اسکول میں تعلیم نہیں ہوئی۔ تاہم بعد کو انھوں نے ذاتی محنت سے اپنے اندر لیاقت پیدا کی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بنے۔ ان کی ایک کتاب کا ہندی نام ہے —— روپیہ کی کہانی۔

مسٹر برلا نے "روپیہ کی کہانی"، لکھی حالانکہ بالآخر وہ خود "راکھ کی کہانی" بننے والے تھے۔ یہی ہر آدمی کا معاملہ ہے۔ ہر آدمی اپنی کامیابی کی داستان لکھ رہا ہے۔ حالانکہ آخر کار وہ جہاں پہنچنے والا ہے وہ مکمل بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

حقیقت انسانی

سب سے بڑی نیکی حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ اس دنیا میں سارا اختیار صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان بالکل عاجز اور بے بس ہے۔ مگر اس دنیا میں انسان کو بظاہر ایسے حالات میں رکھا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح آزاد اور خود مختار محسوس کرے۔ یہی انسان کا امتحان ہے۔ جو آدمی حقیقی صورت حال کو سمجھے اور اس کا اعتراف کر کے خدا کے آگے جھک جائے، وہ قابل انعام ٹھہرا۔ اس کے برعکس جو آدمی امتحانی پردے کو پھاڑنے میں کامیاب نہ ہوا اور خدا کی بڑائی کے آگے اپنے کو نہ جھکائے وہ مجرم ہے۔ ایسا شخص عنقریب سخت ترین عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔

دنیا میں وہ مسئلہ ہمیشہ بہت بڑے پیمانے پر پایا گیا ہے جس کو خرابی کا مسئلہ (Problem of evil) کہا جاتا ہے۔ انسان کے ساتھ موجودہ دنیا میں بے شمار قسم کے دکھ لگے ہوئے ہیں۔ ایک شخص تندرست و توانا ہے اور اچانک موت آکر اس کو دبوچ لیتی ہے۔ ایک شخص کے ساتھ حادثہ پیش آتا ہے اور اس کے شاندار جسم کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ اسی طرح بیماریاں، قحط، زلزلے اور طرح طرح کی آفتیں انسان کے منصوبوں کو اس طرح تہس نہس کرتی رہتی ہے جیسے ان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

بظاہر یہ بڑا بے رحمی کا معاملہ ہے۔ مگر اس کے اندر زبردست حکمت چھپی ہوئی ہے۔ یہ تمام ناخوشگوار واقعات اس لئے پیش آتے ہیں کہ انسان کی آنکھ کھولیں۔ وہ انسان کو یاد دلائیں کہ بظاہر بااختیار ہونے کے باوجود وہ کس قدر بے بس ہے۔ سب کچھ کا مالک ہونے کے باوجود وہ کتنا زیادہ بے کچھ ہے۔ یہ خرابیاں دراصل بڑی قیامت سے پہلے چھوٹی قیامت ہیں۔ اس طرح ظواہر کا پردہ پھاڑ کر انسان کو اصل حقیقت کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ قیامت میں جو پردہ مکمل طور پر پھاڑا جانے والا ہے وہ حادثات کے ذریعہ جزئی طور پر پھاڑ دیا جاتا ہے۔

دنیا کی مصیبتیں انسان کو اس کی بے بسی کی یاد دلاتی ہیں۔ وہ اس کو ذہنی طور پر اس قابل بناتی ہیں کہ وہ حقیقت واقعہ کو پالے اور اس کو مان کر خدا کے انعامات کا مستحق بنے۔ آنے والی ابدی دنیا میں انسان حقیقی طور پر آزاد اور خود مختار ہوگا۔ وہاں وہ ہر قسم کے دکھ اور غم سے مکمل طور پر محفوظ رہے گا۔ مگر یہ درجہ کسی کو بطور انعام ملے گا نہ کہ بطور استحقاق۔ جس نے اپنے عجز کو جان لیا وہی اس قابل ہے کہ اس کو آزادی کی نعمت عطا ہو۔ جو اپنی بے اختیاری پر راضی ہوگیا اسی نے اس اہلیت کا ثبوت دیا کہ خدا اس کو اپنی معیاری دنیا میں بااختیار بنا کر رکھے۔

روحانی تہذیب

بچوں کا ایک کھیل ہوتا ہے جس کا نام جگسا پزل (Jigsaw Puzzle) ہے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی چیز کی مکمل تصویر کو الگ الگ ٹکڑوں میں کاٹ دیتے ہیں۔ یہ گتہ یا پلاسٹک یا لکڑی کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ یہ مختلف انداز کے ٹکڑے بچوں کو دے دئے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان کو اس طرح جوڑو کہ فلاں چیز (مثلاً اونٹ) کی صورت بن جائے۔ جو بچہ ٹکڑوں کو جوڑ کر مطلوبہ صورت بنا لے وہ کامیاب کہا جاتا ہے اور جو بچہ مطلوبہ صورت نہ بنا سکے وہ ناکام قرار پاتا ہے۔

ایک اسکول میں بچوں کو جانچنے کے لئے اسی قسم کا ایک کھیل دیا گیا۔ اس میں موٹے گتہ کے بہت سے ٹکڑے تھے۔ ان کو جوڑ کر ہندستان کا نقشہ بنانا تھا۔ بچے ٹکڑوں کو ادھر ادھر جوڑتے رہے۔ مگر ہندستان کی مکمل تصویر کسی طرح نہ بن پاتی تھی۔ آخر ایک طالب علم کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ "ممکن ہے ان ٹکڑوں میں کہیں کوئی اشارہ موجود ہو" یہ سوچ کر اس نے ایک ٹکڑے کو الٹ کر دیکھا تو اس کے پیچھے ہلکی سیاہی سے "آسام" لکھا تھا۔ اب اس کو ایک سراغ مل گیا۔ اس کے بعد اس نے مزید ٹکڑے اُلٹے تو ہر ایک پر ملک کی کسی نہ کسی ریاست کا نام دھندلے حروف میں درج تھا۔ اب وہ راز کو سمجھ گیا۔ اس نے جان لیا کہ ہر ٹکڑا کسی نہ کسی متعین ریاست کی نمائندگی کر رہا ہے۔

بچہ کے ذہن میں ہندستان کے مجموعی نقشہ کا تصور پہلے سے موجود تھا۔ اس نے اس اجمالی تصوّر کے مطابق ٹکڑوں کو جوڑنا شروع کیا۔ اب فوراً ہی ہندستان کا نقشہ بن کر تیار تھا۔ یہ طالب علم کامیاب ہوا اور بقیہ تمام طالب علم ناکام قرار دیدیے گئے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ اس دنیا کا ہے جس کے بنانے والے نے اس کو بنا کر انسان کو یہاں رکھا ہے۔ یہ دنیا بھی ایک قسم کا جگسا پزل کا کھیل ہے۔ انسان کا امتحان یہی ہے کہ وہ یہ کھیل کھیلے اور اس میں کامیابی حاصل کرے۔

انسان کو مشین کی ضرورت تھی۔ اس کو خودکار سواریوں کی ضرورت تھی۔ اس کو آرام دہ مکانات کی ضرورت تھی۔ اس کو بے شمار دوسری مادی چیزیں درکار تھیں۔ مگر قدرت نے ایسا نہیں کیا کہ ان چیزوں کو بنا بنایا آسمان سے اتار دے۔ اس دنیا میں ہوا اور پانی اور روشنی جیسی چیزیں تو موجود ہیں مگر ٹائپ رائٹر موٹر کار اور رہائشی بنگلے کہیں تیار شدہ حالت میں موجود نہیں۔ ان چیزوں کو آدمی خود بنا کر تیار کرتا ہے۔

ان کو بنانے کی صورت کیا ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ قدرت نے ان کے تمام اجزا رخام شکل میں زمین پر پھیلا دئے۔ کچھ چیزوں کو زمین کے نیچے دفن کر دیا۔ یہ گویا ایک عظیم جگسا پزل کے بہت سے ٹکڑے ہیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اب انسان کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ ان کو تلاش کر کے حاصل کرے اور ان کو جوڑ کر بامعنی چیزیں بنائے۔

جدید مادی تہذیب کی صورت میں انسان نے بے شمار نئی نئی چیزیں بنائی ہیں۔ یہ سب چیزیں اگرچہ مکمل طور پر ہماری اس دنیا کے سامانوں سے بنی ہیں مگر ان میں سے کوئی چیز بھی اپنی موجودہ تکمیلی صورت میں کہیں موجود نہیں تھی۔ انسان نے ان کے مختلف بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کیا اور لمبے تجربے کے بعد ان کو جگسا پزل کی طرح جوڑ کر بامعنی چیزوں کی صورت میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسی عمل کے نتائج ہیں جن کو ٹیلی فون، کار اور فرنیچر کہتے ہیں۔

یہ ہماری مادی تہذیب کا معاملہ تھا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ ہماری روحانی تہذیب کا بھی ہے۔ دونوں جگہ قدرت نے ایک ہی نمونہ کو ہمارے لئے پسند کیا ہے۔ روحانی دنیا کی تعمیر کا معاملہ بھی ایک قسم کے جگسا پزل کا معاملہ ہے۔ مادی دنیا کی تعمیر کے لئے قدرت نے ہمارے چاروں طرف مادی ٹکڑے بکھیرے تھے۔ یہاں قدرت نے اسی طرح بہت سے معنوی ٹکڑے ہمارے چاروں طرف بکھیر دئے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہر ٹکڑے پر مخفی اشارات بھی درج ہیں۔ انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ ان اشارات کو پڑھے اور ان کے مطابق مختلف ٹکڑوں کو اپنے اپنے مقام پر جوڑ کر صحیح اور بامعنی تصویر بنائے۔

یہی موجودہ دنیا میں آدمی کا اصل امتحان ہے۔ آدمی کو بہر حال یہاں اس امتحان میں کھڑا ہونا ہے کہ وہ ان ٹکڑوں پر لکھے ہوئے مخفی اشاروں کو پہچانے اور ان کے مطابق بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر مطلوبہ تصویر بنائے۔ مادی تہذیب کی تعمیر میں اگر انسان قدرت کے اس نہج کی پیروی نہ کرتا تو اس کو کبھی جدید طرز کا جگمگاتا ہوا شہر دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر وہ روحانی تہذیب کی تعمیر میں سنجیدگی کے ساتھ اس نہج کی پیروی نہ کرے تو اس کے لئے یہاں ناکامی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

انسان کی تمام گمراہیاں اسی مخصوص جانچ میں ناکام ہونے کا نتیجہ ہیں۔ انسان مادی تہذیب کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ان کا جگسا پزل بنانے کے معاملہ میں انتہائی سنجیدہ تھا اس لئے وہاں وہ پوری طرح کامیاب ہوا۔ اس کے برعکس روحانی تہذیب کے معاملہ میں وہ پوری طرح سنجیدہ نہیں۔ اسی لئے اس دوسرے میدان میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان صحیح طور پر اپنا جگسا پزل بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

شرک، الحاد اور دوسرے تمام غلط قسم کے فکری نظام اسی لئے وجود میں آئے کہ انسان قدرت کے مختلف ٹکڑوں پر لکھے ہوئے اشارات کو پڑھ نہ سکا اور ان کو اِدھر کا اُدھر اور اُدھر کا اِدھر جوڑ دیا۔ مثال کے طور پر مظاہر کائنات میں تنوع کو دیکھ کر اس نے خدائی میں تنوع کا عقیدہ قائم کر لیا۔ اس نے کہا کہ جب چیزیں کئی ہیں تو ان کے خدا بھی کئی ہونے چاہئیں۔ حالانکہ مظاہر کائنات میں تنوع خدا کی صفات میں تنوع کی علامت تھی نہ کہ خود خدائی میں تنوع کی علامت۔ اسی طرح کائنات میں نظام تعلیل ((Causatian)) کی دریافت کو اس نے خدا کی دریافت کے ہم معنی سمجھ لیا۔ حالانکہ وہ خدا کے طریق کار کی دریافت کے ہم معنی تھا نہ کہ خود خدا کی دریافت کے ہم معنی، وغیرہ۔

اب دیکھئے کہ ان ٹکڑوں پر کس قسم کے اشارات لکھے ہوئے ہیں اور کس طرح انھیں بامعنی طور پر جوڑا جا سکتا ہے۔ جب ہم اس نظر سے انسان اور کائنات کے معاملہ پر غور کرتے ہیں تو مختلف رہنما چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً ہنسی۔ اس کائنات میں صرف ایک انسان ہے جو ہنستا ہے۔ ہنسنے کی طاقت ہوا اور پانی، جنگل اور پہاڑ، چاند اور ستارے، کسی چیز میں نہیں۔ حتیٰ کہ جانوروں اور پرندوں میں بھی نہیں۔ ہنسنا انسان کی انتہائی امتیازی خصوصیت ہے۔ ہنسنا شعوری لذّت کی علامت ہے اور لذّت کا شعور انسان کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری معلوم کائنات میں انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جس کے لئے ہنسی (بالفاظ دیگر خوشی) مقدر کی گئی ہے۔ انسان کے سوا کوئی بھی دوسری مخلوق ایسی نہیں جو ہنسے اور خوشی منائے۔

اس کے بعد جب ہم مزید غور کرتے ہیں تو ہمیں اس جگسا پزل کا ایک اور اشاراتی ٹکڑا ہاتھ آتا ہے۔ اور وہ لذّت ہے۔ یہاں بھی ہم پاتے ہیں کہ انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو لذّت کو جانتا ہے۔ کھانا، پینا، ازدواجی تعلقات وغیرہ، بظاہر انسان اور جانوروں میں مشترک ہیں۔ مگر جانوروں کے لئے ان چیزوں میں کوئی لذّت نہیں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں جبلت اور ضرورت کے لئے کرتے ہیں نہ کہ لذت لینے کے لئے۔ اس کے برعکس انسان جب کھاتا پیتا ہے، جب وہ ازدواجی تعلّق قائم کرتا ہے تو وہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ لطف و لذّت انسان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ کسی بھی دوسری مخلوق کو یہ چیز حاصل نہیں۔

مذکورہ اشارات نے ہمیں کائناتی جگسا پزل کے دو ٹکڑوں کی طرف رہنمائی کی۔ ایک ہنسی اور دوسرے لذّت۔ اس سے ہم نے جانا کہ انسان کی فطرت کے اعتبار سے اس کی کامیابی یہ ہوگی کہ اس کو خوشی ملے، وہ لذّت کا مالک بن سکے۔

اس کے بعد ہم مزید مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے علم میں ایک اور ٹکڑا آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہنسی

اور لذّت کے احساسات اگرچہ صرف انسان کو ملے ہیں۔ مگر موجودہ دنیا میں کوئی انسان ان کو پورے طور پر حاصل کرنے پر قادر نہیں۔ یہاں کی محدودیتیں (Limitations) فیصلہ کن طور پر انسان کی راہ میں حائل ہیں۔ بیماری، حادثہ، بڑھاپا، موت اور اسی طرح اپنے اندر اور باہر کی دوسری کمیاں ہماری دنیا کی زندگی کو بے مسرت اور بے لذت کر دیتی ہیں۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں ان کو ہم موجودہ دنیا میں حاصل نہیں کر پاتے۔

یہاں پہنچ کر جب ہم مزید غور کرتے ہیں تو ایک اور اشاراتی ٹکڑا ہمارے ہاتھ آتا ہے۔ اور وہ انسان کی یہ خصوصیت ہے کہ تمام معلوم چیزوں میں وہی ایک ایسی مخلوق ہے جو کل (Tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ سورج آج ڈوبتا ہے اور کل طلوع ہوتا ہے۔ مگر سورج کو کل کا شعور نہیں۔ چیونٹی اگلے موسم کے لئے خوراک جمع کرتی ہے اور بیا اپنی آئندہ نسل کے لئے گھونسلے بناتا ہے۔ مگر چیونٹی یا بیا یہ سب کچھ جبلت (Instinct) کے تحت کرتے ہیں نہ کہ "کل" کے تصور کے تحت۔

تمام موجودات میں "کل" کا تصور صرف انسان کے اندر پایا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ کل کی کامیابی صرف انسان کے لئے خاص ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز ہم چاہتے ہیں اور اپنی محدودیتوں کی وجہ سے اس کو حاصل نہیں کر سکتے وہ ہمارے لئے کل کے دن (بالفاظ دیگر مستقبل میں) مقدر کی گئی ہے۔ موجودہ دنیا میں ہم اپنی اس طلب کا صرف جزئی تعارف حاصل کرتے ہیں۔ اس کو ہم کامل طور پر صرف کل کے دور میں پائیں گے۔

یہاں پہونچ کر ایک اور اشاراتی ٹکڑا ہماری رہنمائی کرتا ہے اور وہ نیند ہے۔ ہر آدمی پر نیند طاری ہوتی ہے۔ وہ بے خبر ہو کر سو جاتا ہے۔ مگر عین اس وقت جب کہ آدمی کا جسم ایک قسم کی موت کی آغوش میں ہوتا ہے اس کا ذہن (یا روح) پوری طرح زندہ ہوتا ہے۔ آدمی کا ذہن اس وقت بھی سوچتا ہے۔ وہ سفر کرتا ہے۔ وہ فیصلے کرتا ہے۔ گویا جسمانی موت کے باوجود انسان کا ذہنی وجود پوری طرح زندہ رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی نہ صرف کل کا تصوّر رکھتا ہے بلکہ وہ کل کے دن تک زندہ موجود بھی رہتا ہے۔ موت کے باوجود وہ ختم نہیں ہوتا۔ آدمی کی زندگی ایک ایسا تسلسل ہے جو "آج" سے لے کر "کل" تک چلا گیا ہے۔

اب ہماری تصویر حیات ایک حد تک پوری ہو چکی ہے۔ تاہم ایک چیز ابھی باقی ہے۔ وہ یہ کہ کل کا دن کس کے لئے کیا ہوگا اور کس کے لئے کیا نہیں ہوگا۔ یہاں جب ہم اپنی تلاش جاری کرتے ہیں تو دوبارہ ہم کو جگسا پزل کا ایک اور اشاراتی ٹکڑا ملتا ہے، جو ہماری تصویر کو مکمل کر دیتا

ہے۔ یہ ٹکڑا ہے انسان کے اندر خیر اور شر (صحیح اور غلط) کا تصوّر۔

معلوم کائنات میں یہ صرف انسان کی انفرادی خصوصیت ہے کہ وہ کسی چیز کو صحیح سمجھتا ہے اور کسی چیز کو غلط۔ حقیقت واقعہ کا اعتراف اس کے نزدیک سب سے بڑی نیکی ہے اور حقیقت واقعہ کا انکار اس کے نزدیک سب سے بڑی بُرائی اسی طرح امانت اور خیانت' احسان مندی اور احسان فراموشی' سچ اور جھوٹ' وعدہ خلافی اور بے وفائی' انصاف اور ظلم' تواضع اور سرکشی، حق کی ادائیگی اور حق کی پامالی کے درمیان وہ فرق کرتا ہے۔ وہ ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط سمجھتا ہے۔ یہ واقعہ انسان کے معاملہ کو دوسری مخلوقات کے معاملہ سے الگ کر دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی کامیابی اخلاقی معیار پر جانچی جائے گی جب کہ دوسری چیزوں کی کامیابی صرف مادی اعتبار سے دیکھی جاتی ہے۔

ہمارے جگسا پزل کا یہ آخری ٹکڑا ہماری تصویر کو بالکل مکمّل کر دیتا ہے۔ اس کو ملانے کے بعد حیات انسانی کا جو کامل تصور بنتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان ہی واحد مخلوق ہے جس کے لئے اس کے پیدا کرنے والے نے خوشی اور لذّت کو مقدّر کیا ہے۔ مگر یہ خوشی اور لذّت اس کو "آج" کی زندگی میں ملنے والی نہیں۔ یہ اس کو صرف "کل" کی زندگی میں ملے گی۔ تاہم یہ لازوال نعمت ہر آدمی کو اپنے آپ نہیں مل جائے گی۔ اس کے لئے اسے ایک امتحان میں کامیاب ہونا پڑے گا۔ وہ یہ کہ آدمی "آج" کی زندگی میں اس کے واقعی استحقاق کا ثبوت دے۔ وہ انکار حق سے بچے اور اقرار حق کی میزان پر پورا اُترے۔ وہ غلط روش کو چھوڑے اور صحیح روش کو اختیار کرے۔ وہ وقتی سطح پر جینے کے بجائے ابدیت کی سطح پر جیئے۔ وہ صرف "آج" والا بن کر رہنے کے بجائے "کل" والا بن کر رہے۔ جو شخص ایسا کرے گا وہ آنے والی "کل" کی زندگی میں کامل انسان کے روپ میں ظاہر ہوگا۔ وہ اس خوشی اور لذّت کو ابدی طور پر پالے گا جس کا موجودہ زندگی میں اس نے صرف ابتدائی تعارف حاصل کیا تھا۔

مادی تہذیب وقتی دنیا کی تعمیر ہے اور روحانی تہذیب ابدی دنیا کی تعمیر۔ تاہم دونوں دنیاؤں میں کامیابی کا ایک ہی اصول ہے۔ قدرت کے منتفرق اشاروں کو پڑھ کر ان سے ایک کامل نقشہ بنانا۔

موجودہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جن قوموں نے قدرت کے اشاروں کو نہیں پڑھا اور قدرت کے چھپے ہوئے مواقع کو اپنے حق میں استعمال نہیں کیا وہ پچھڑی ہوئی قومیں بن کر رہ گئیں۔ ان کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ وہ دوسری ترقی یافتہ قوموں کی سیاسی اور معاشی غلام بن کر رہ جائیں۔

اسی طرح آنے والی دنیا میں وہ لوگ کامیاب رہیں گے جنھوں نے اپنے اندر روحانی تہذیب کی تشکیل کی اور وہ لوگ برباد ہو کر رہ جائیں گے جو اپنے اندر روحانی تہذیب کی تشکیل نہ کر سکے۔ ہماری موجودہ زندگی ہماری اگلی زندگی کا تعارف ہے۔ انسان کا آج کا انجام اس کے کل کے انجام کو بتا رہا ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَرَزَقَنِىْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝۸۸ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ۝۸۹ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝۹۰

شعیب نے کہا کہ اے میری قوم، بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے اپنی جانب سے مجھ کو اچھا رزق بھی دیا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میں خود وہی کام کروں جس سے میں تم کو روک رہا ہوں۔ میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جہاں تک ہو سکے۔ اور مجھے توفیق تو اللہ ہی سے ملے گی۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے۔ اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ اور اے میری قوم، ایسا نہ ہو کہ میری ضد کر کے تم پر وہ آفت آپڑے جو قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر آئی تھی، اور لوط کی قوم تو تم سے دور بھی نہیں۔ اور اپنے رب سے معافی مانگو پھر اس کی طرف پلٹ آؤ۔ بے شک میرا رب مہربان اور محبت والا ہے۔ ۸۸-۹۰

ماننے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے تقلیدی طور پر ماننا۔ دوسرا صحیح سمجھ کر ماننا۔ پہلی صورت میں آدمی کسی بات کو اس لئے مانتا ہے کہ لوگ اس کو مانتے ہیں۔ دوسری صورت میں وہ اس کو اس لئے مانتا ہے کہ اس نے خود دلیل کی بنیاد پر پایا ہے کہ وہ بات صحیح ہے۔ اوّل الذکر اگر رسمی اقرار ہے تو ثانی الذکر شعوری دریافت۔

حق کو دلیل (یا شعور) کی سطح پر پانا ہی مومن کا اصل سرمایہ ہے۔ اسی سے وہ زندہ یقین حاصل ہوتا ہے جب کہ آدمی ہر چیز سے بے پروا ہو کر لوگوں کے درمیان کھڑا ہو اور حق کی نمائندگی کر سکے۔ حق کی شعوری یافت ہر دوسری چیز کا بدل ہے۔ جس کو یہ نعمت حاصل ہو جائے اس کو پھر کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

عام آدمی "روٹی" پر جیتا ہے۔ مومن وہ انسان ہے جو دلیل حق پر جیتا ہے۔ اس طرح کا رزق (شعوری یافت) ملنے کے بعد آدمی کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے خلاف رویہ اختیار کرے۔

قول وعمل کا تضاد رسمی ایمان کا نتیجہ ہے اور قول وعمل کی یکسانیت شعوری ایمان کا نتیجہ۔

"شقاق" کی تشریح میں حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ میری دشمنی تم کو ایمان کا راستہ چھوڑ دینے پر نہ ابھارے کہ اس کے بعد تم کو وہ سزا ملے جو کافروں کو ملی (لا یحملنکم معاداتی علی ترک الایمان فیصیبکم ما اَصَابَ الکفّارَ، القرطبی)

داعی چونکہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو ایک عام انسان کی مانند نظر آتا ہے۔ اس لئے اس کی ناقدانہ باتوں سے وہ لوگ بگڑ اٹھتے ہیں جن کو ماحول میں اونچی حیثیت حاصل ہو۔ ایک معمولی آدمی کی یہ جرأت ان کے لئے ناقابل برداشت ہوجاتی ہے کہ وہ ان پر اور ان کے بڑوں پر تنقید کرے۔ اس وجہ سے ان کے اندر داعی کے خلاف ضد اور نفرت پیدا ہوجاتی ہے۔

کسی آدمی کے اندر اس قسم کی نفسیات کا پیدا ہونا اس کا نہایت کڑے امتحان میں مبتلا کیا جانا ہے۔ کیونکہ ایسا آدمی ایک شخص کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے اس کی طرف سے آنے والی خدائی بات کو بھی حقیر سمجھ لیتا ہے۔ وہ ایک انسان کو نظر انداز کرنے کے نام پر خود خدا کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْنَا ضَعِیْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْنَا بِعَزِیْزٍ ﴿۹۱﴾ قَالَ یٰقَوْمِ اَرَهْطِیْۤ اَعَزُّ عَلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِیًّا ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴿۹۲﴾ وَیٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْۤا اِنِّیْ مَعَكُمْ رَقِیْبٌ ﴿۹۳﴾

انھوں نے کہا کہ اے شعیب، جو تم کہتے ہو اس کا بہت سا حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں کمزور ہے۔ اور اگر تیری برادری نہ ہوتی تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے۔ اور تم ہم پر کچھ بھاری نہیں۔ شعیب نے کہا کہ اے میری قوم، کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے۔ اور اللہ کو تم نے پس پشت ڈال دیا۔ بے شک میرے رب کے قابو میں ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور اے میری قوم، تم اپنے طریقہ پر کام کیے جاؤ اور میں اپنے طریقہ پر کرتا رہوں گا۔ جلد ہی تم کو معلوم ہوجائے گا کہ کس کے اوپر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ اور انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں ۹۱ - ۹۳

حضرت شعیب کو حدیث میں خطیب الانبیاء کہا گیا ہے۔ آنجناب اپنی قوم کو اس کی اپنی قابل فہم زبان میں نہایت موثر انداز میں سمجھاتے تھے۔ پھر آپ کی بات اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قوم کا ذہنی

سانچہ بگڑا ہوا تھا۔ اس کے سوچنے کا انداز اور تھا اور حضرت شعیب کے سوچنے کا انداز اور۔ اس بنا پر آنجناب کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

قوم انسانوں کی تعظیم میں گم تھی۔ آپ اس کو ایک اللہ کی تعظیم کی طرف بلاتے تھے۔ وہ خوش عقیدگی کو نجات کا ذریعہ سمجھے ہوئے تھی، آپ کا کہنا تھا کہ صرف عمل کے ذریعہ نجات ہوسکتی ہے۔ قوم کا خیال تھا کہ وہ اپنے کو مومن سمجھتی ہے اس لئے وہ مومن ہے۔ آپ نے کہا کہ مومن وہ ہے جو خدا کی میزان میں مومن قرار پائے۔ قوم کے نزدیک نماز کی حیثیت بس ایک غیر موثر قسم کے رسمی ضمیمہ کی تھی۔ آپ نے اعلان کیا کہ نماز آدمی کی زندگی اور اس کے آمد و خرچ کی محاسب ہے۔ قوم سمجھتی تھی کہ ایمان بس ایک بے روح اقرار ہے، آپ نے بتایا کہ ایمان وہ ہے جو ایک زندہ شعور کے طور پر حاصل ہوا ہو۔

اس طرح حضرت شعیب اور ان کی قوم کے درمیان ایک قسم کا فصل (Gap) پیدا ہوگیا تھا۔ یہی ذہنی فصل قوم کے لئے آپ کی سیدھی اور سچی بات کو سمجھنے میں رکاوٹ بنا رہا۔

"اگر تمھارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے"۔ یہ جملہ بتاتا ہے کہ حضرت شعیب کی قوم کس قدر بے حس اور ظاہر پرست ہو چکی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ حضرت شعیب نے جب قوم کے دینی بھرم کو بے نقاب کیا تو قوم کے لوگ ان کے دشمن بن گئے۔ اس وقت حضرت شعیب کے ساتھ نہ عوام کی بھیڑ تھی جو لوگوں کو روکے اور نہ آپ دولت اور حیثیت کے مالک تھے جس کو دیکھ کر لوگ مرعوب ہوں۔ آپ کے پاس صرف صداقت اور معقولیت کا زور تھا اور ایسے لوگوں کے نزدیک صرف صداقت اور معقولیت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

ایسی حالت میں وہ یقیناً آپ پر قاتلانہ حملہ کر دیتے۔ تاہم جس چیز نے انھیں اس قسم کے اقدام سے روکا وہ قبیلہ کے انتقام کا اندیشہ تھا۔ قبائلی دور میں قبیلہ کے کسی فرد کو مارنے کا مطلب یہ تھا کہ قبائلی دستور کے مطابق پورا قبیلہ اس سے خون کا بدلہ لینے کے لئے اُٹھ کھڑا ہو جائے۔ یہ اندیشہ قوم شعیب کے لئے آپ کے خلاف کسی انتہائی اقدام میں مانع بن گیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے موجودہ زمانہ میں شریر افراد کی شرارت سے اکثر اوقات لوگ اس لئے محفوظ رہتے ہیں کہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے کوئی جارحیت کی تو ان کو پولیس اور عدالت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٩٤﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿٩٥﴾

اور جب ہمارا حکم آیا، ہم نے شعیب کو اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو کڑک نے پکڑ لیا۔ پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ گویا کہ کبھی ان میں بسے ہی نہ

تھے۔ سنو، پھٹکار ہے مدین کو جیسے پھٹکار ہوئی تھی ثمود کو۔ ۹۵-۹۴

حضرت شعیب کی قوم کے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ مدین کے مالک ہیں جو چیز انھیں امتحان کی مصلحت کے تحت دی گئی تھی اس کو انھوں نے اپنا مستقل حق سمجھ لیا۔ اس احساس کے تحت انھوں نے آپ کے خلاف جارحانہ تدبیریں کیں۔ انھوں نے آپ کو یہ دھمکی بھی دی کہ ہم تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے (الاعراف ۸۸) مگر وہی زمین جس کو وہ اپنی زمین سمجھتے تھے اور جس کے وہ مالک بنے ہوئے تھے۔ وہاں خدا کے حکم سے ہولناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ زلزلہ آیا۔ جس کے نتیجہ میں یہ پورا علاقہ تباہ ہوگیا۔ وہ خود اپنی دنیا میں اس طرح مٹ کر رہ گئے جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ تھا۔

البتہ قوم کے وہ افراد جنھوں نے حضرت شعیب کی بات مانی تھی اور آپ کے ساتھ ہوگئے تھے ان کو خصوصی نصرت سے بچالیا گیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَاُتْبِعُوْا فِىْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور واضح سند کے ساتھ بھیجا، فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف۔ پھر وہ فرعون کے حکم پر چلے حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔ قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے ہوگا اور ان کو آگ پر پہنچائے گا۔ اور کیسا بُرا گھاٹ ہے جس پر وہ پہنچیں گے۔ اور اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگادی گئی اور قیامت کے دن بھی۔ کیسا بُرا انعام ہے جو اُن کو ملا۔ ۹۹-۹۶

حضرت موسیٰ نے حق کی دعوت آخری ممکن حد تک پیش کردی۔ انھوں نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو نہ صرف نظری طور پر بے دلیل کر دیا۔ بلکہ عصا کے معجزے کی صورت میں اپنی صداقت کا کھلا ہوا ظاہری ثبوت بھی انھیں دکھادیا پھر بھی فرعون کی قوم فرعون ہی کے ساتھ رہی، وہ حضرت موسیٰ کا ساتھ دینے پر تیار نہ ہوئی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے نزدیک ساری اہمیت اقتدار اور دنیوی ساز وسامان کی تھی اور یہ چیزیں وہ حضرت موسیٰ کے اندر نہ دیکھتے تھے۔ وہ آپ کی باتوں پر حیران ضرور ہوتے تھے۔ مگر جب وہ حضرت موسیٰ کا مقابلہ فرعون سے کرتے تو ان کو ایک طرف بے سروسامانی دکھائی دیتی اور دوسری طرف ہر قسم کا مادی جاہ وجلال۔

یہ تقابل ان کے لئے فیصلہ کُن بن گیا۔ اور وہ دلائل اور معجزات دیکھنے کے باوجود اس کے لئے تیار نہ ہوئے کہ فرعون کو چھوڑ دیں اور اس سے الگ ہو کر حضرت موسیٰ کے ساتھ ہو جائیں۔

جو لوگ دنیا میں کسی کا ساتھ صرف اس لئے دیں گے کہ اس کے پاس مادی بڑائی کی چیزیں تھیں، وہ آخرت میں بھی اس کے ساتھ کر دئے جائیں گے۔ مگر دنیا کے برعکس، یہ بہت برا ساتھ ہوگا۔ کیونکہ اس دن اس آدمی سے اس کا تمام سامان چھن چکا ہوگا۔ اب اس کا وجود صرف ذلّت اور بربادی کا نشان ہوگا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی اسی آگ میں پہنچا دے گا جو خود اس کے لئے اس کی گمراہ قیادت کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے مقدر کی جاچکی ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿١٠٠﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿١٠١﴾

یہ بستیوں کے کچھ حالات ہیں جو ہم تم کو سنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اب تک قائم ہیں اور بعض مٹ گئیں۔ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ پھر جب تیرے رب کا حکم آگیا تو ان کے معبود ان کے کچھ کام نہ آئے جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے۔ اور انھوں نے ان کے حق میں بربادی کے سوا اور کچھ نہیں بڑھایا۔ ۱۰۱ - ۱۰۰

قدیم تاریخوں میں بادشاہوں اور فوجی جنرلوں کے حالات درج ہیں مگر نبیوں اور ان کی اقوام کے حالات کسی تاریخ میں درج نہیں۔ دوسری طرف قرآن کو دیکھئے تو اس میں سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ نبیوں اور ان کی قوموں کے حالات ملتے ہیں۔ بقیہ باتیں اس نے اس طرح نظر انداز کر دی ہیں جیسے اس کی نظر میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ انسان نے جو تاریخ لکھی اس میں اس نے وہی بات چھوڑ دی جو خالق کے نزدیک سب سے زیادہ قابل تذکرہ تھی۔

دور نبوت کی ان ہلاک شدہ بستیوں میں سے بعض بستیاں ایسی ہیں جو ابھی تک آباد ہیں۔ جیسے مصر جو فرعون کا مقام تھا۔ دوسری طرف قوم ہود اور قوم لوط جیسی اقوام ہیں جن کی بستیاں ان کے باشندوں سمیت ناپید ہوگئیں۔ البتہ کہیں کہیں ان کے کچھ نشانات کھنڈر کی صورت میں کھڑے ہیں یا زمین کی کھدائی سے برآمد کئے گئے ہیں۔

ان بستیوں کا ہلاک کیا جانا بظاہر ایک ظالمانہ واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب یہ دیکھئے کہ کیوں ایسا ہوا

تو وہ عین مطابق حقیقت بن جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ان کی اپنی بدعملی کے نتائج تھے۔ جو کچھ ہوا وہ ان کی بدکرداری کے بعد ہوا نہ کہ ان کی بدکرداری سے پہلے۔

جب بھی آدمی سرکشی اور ظلم کرتا ہے تو وہ کسی برتے پر کرتا ہے۔ وہ کچھ چیزوں یا ہستیوں کو اپنا سہارا سمجھ لیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ مشکل وقتوں میں اس کے مددگار ثابت ہوں گے۔ مگر یہ سہارے اسی وقت تک سہارے ہیں جب تک خدا ڈھیل دے رہا ہو۔ جب خدا کے قانون کے مطابق ڈھیل کی مدت ختم ہو جائے اور خدا اپنا آخری فیصلہ ظاہر کر دے اس وقت آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب محض جھوٹے مفروضے تھے جن کو اس نے اپنی نادانی کی وجہ سے سہارا سمجھ لیا تھا۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ ۭ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِىٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾

اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جب کہ وہ بستیوں کو ان کے ظلم پر پکڑتا ہے۔ بے شک اس کی پکڑ بڑی دردناک اور سخت ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈریں۔ وہ ایک ایسا دن ہے جس میں سب لوگ جمع ہوں گے۔ اور وہ حاضری کا دن ہوگا۔ اور ہم اس کو ایک مدت کے لئے ٹال رہے ہیں جو مقرر ہے۔ جب وہ دن آئے گا تو کوئی جان اس کی اجازت کے بغیر کلام نہ کر سکے گی۔ پس ان میں کچھ بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت ۱۰۵-۱۰۲

موجودہ دنیا میں انسان کو رہنے اور بسنے کا موقع صرف امتحان کی بنا پر حاصل ہے۔ پیغمبروں کے ذریعہ اتمام حجت کے بعد بھی جو لوگ منکر بنے رہیں وہ خدا کی زمین میں مزید ٹھہرنے کا حق کھو دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں کے منکرین کو خدا نے ہلاک کر دیا (عنکبوت ۴۰) یہ ہلاکت زیادہ تر اس طرح ہوئی کہ عام زمینی آفتوں میں شدت پیدا کر دی گئی مثلاً آندھی، سیلاب، یا زلزلہ، جو عام حالات میں ایک حد کے اندر رہتے ہیں، ان کو غیر محدود طور پر شدید کر دیا گیا۔

ماضی میں اس طرح قوموں کی تباہی کے واقعات کو جغرافی تاریخ کے علماء موسمی تغیرات (Climatic Pulsations) کا نام دیتے ہیں۔ گویا جو کچھ ہوا وہ محض جغرافی اتھل پتھل کے نتیجہ میں ہوا۔ اگرچہ وہ اس واقعہ کی کوئی توجیہ نہیں کر پاتے کہ اس قسم کے شدید موسمی تغیرات صرف ماضی میں کیوں پیش آئے۔ وہ اب (ختم نبوت

کے بعد) کیوں نہیں پیش آتے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعات سادہ معنوں میں صرف جغرافی واقعات نہ تھے بلکہ یہ حکم خداوندی کا ظہور تھا۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام عدل پر قائم ہے۔ یہاں خود قانون قدرت کے تحت لازماً ایسا ہونے والا ہے کہ ظالم اپنے ظلم کی سزا پائے اور عادل کو اپنے عدل کا انعام ملے۔ ان واقعات کو موسمی تغیرات کہنا ان کو جغرافیہ کے خانہ میں ڈال دینا ہے۔ اس کے برعکس اگر ان کو خدائی تغیرات مانا جائے تو وہ آدمی کے لئے خوف خدا اور فکر آخرت کا زبردست سبق بن جائیں گے۔

پیغمبروں کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے وہ گویا بڑی قیامت سے پہلے اس کی ایک چھوٹی نشانی تھے۔ ان میں ایسا ہوا کہ منکرین کو ایک مدت تک ڈھیل دی گئی۔ اس کے بعد خدا کا فیصلہ ظاہر ہوا تو سب کے سب ہلاک کر دئے گئے۔ صرف وہ لوگ بچ سکے جو حق کا ساتھ دینے کی وجہ سے خدا کے نزدیک نیک بخت قرار پا چکے تھے۔ ان کے علاوہ جو لوگ خدا کی میزان میں سرکش اور بدبخت تھے وہ لازمی طور پر عذاب کی زد میں آئے۔ حتیٰ کہ پیغمبروں کی سفارش بھی ان کو بچا نہ سکی، جیسا کہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کی مثال سے ثابت ہوتا ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَ اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

ع ۹ | ۹

پس جو لوگ بدبخت ہیں وہ آگ میں ہوں گے۔ ان کو وہاں چیخنا ہے اور دھاڑنا۔ وہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے۔ بے شک تیرا رب کر ڈالتا ہے جو چاہتا ہے۔ اور جو لوگ نیک بخت ہیں تو وہ جنت میں ہوں گے، وہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں، مگر جو تیرا رب چاہے بخشش ہے بے انتہا۔ پس تو ان چیزوں سے شک میں نہ رہ جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ تو بس اسی طرح عبادت کر رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا عبادت کر رہے تھے۔ اور ہم ان کا حصہ انھیں پورا پورا دیں گے بغیر کسی کمی کے ۔ ۱۰۶-۱۰۹

قرآن میں سب سے زیادہ اہمیت اور سب سے زیادہ تکرار کے ساتھ جس چیز کا ذکر ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی موجودہ حالت پر چھوڑ نہیں دیے جائیں گے۔ بلکہ موت کے بعد وہ خدا کی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے۔ وہاں ہر ایک اپنی کارکردگی کے مطابق جنت یا دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

اس اہمیت اور تکرار کی وجہ لوگوں کا "شک" ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ زمین پر بے شمار انسان ایسے ہیں جو خدا کی ہدایت کو نہیں مانتے۔ بے شمار انسان ایسے ہیں جو خدا کی ہدایت سے آزاد ہو کر عمل کرتے ہیں۔ بیشتر انسان خدا پسند زندگی کے بجائے خود پسند زندگی گزار رہے ہیں۔ پھر بھی ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ پھر بھی سارے لوگ کامیاب ہیں۔ بظاہر یہاں کہیں دکھائی نہیں دیتا کہ خدا کے وفاداروں کو کوئی خصوصی انعام مل رہا ہو۔ یا خدا کے نافرمانوں کو کوئی خاص سزا بھگتنی پڑ رہی ہو۔

اس بنا پر لوگوں کو شک ہونے لگتا ہے۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ انسانوں کا جو انجام مسلسل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس کے سوا بھی کوئی انجام ان کے لیے مقدر ہے۔ یہاں قرآن بتاتا ہے کہ لوگوں کا مسلسل غیر حق پر چلنا اس لیے نہیں ہے کہ انھوں نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا اور پھر اس کو معقول پا کر اسے اختیار کر لیا۔ اس کا سبب دراصل رواج کی پیروی ہے نہ کہ دلیل اور معقولیت کی پیروی۔

اس کے باوجود لوگوں کے عمل کا انجام ان کے سامنے نہیں آتا تو اس کا سبب مہلت امتحان ہے۔ زمین پر موت سے پہلے کی زندگی جانچ کی زندگی ہے۔ اس لیے موت تک انسان کو یہاں ڈھیل دی جا رہی ہے کہ وہ جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ موت اس مقررہ مدت کا خاتمہ ہے۔ موت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو مقام امتحان سے اٹھا کر مقام عدالت میں پہنچا دیا جائے۔ وہاں ہر ایک کو وہی ملے گا جس کا وہ فی الواقع مستحق تھا اور ہر ایک سے وہ چھن جائے گا جس کو اس نے استحقاق کے بغیر اپنے گرد جمع کر رکھا تھا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ پھر اس میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات نہ آ چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور ان کو اس میں شبہ ہے کہ وہ مطمئن نہیں ہونے دیتا اور یقیناً تیرا رب ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دے گا۔ وہ باخبر ہے اس سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۱۱۱-۱۱۰

"موسیٰ کی کتاب میں اختلاف"، کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مخاطبین اس کے بیانات کے بارہ میں کئی رائے ہو گئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے جھٹلایا اور کچھ لوگوں نے تسلیم کیا (فاختلف فی ذالک الکتاب۔ فکذب بہ بعضھم وصدق بہ بعضھم، الطبری)

جب بھی کوئی بات کہی جائے تو آدمی اس کے بارہ میں ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک، صحیح تعبیر۔ دوسرے، غلط تعبیر۔ اگر سننے والے فی الواقع سنجیدہ ہوں تو وہ ہمیشہ ایک ہی صحیح تعبیر تک پہنچیں گے ان کی سنجیدگی ان کے لئے اتحاد رائے کی ضامن بن جائے گی۔ اس کے برعکس اگر وہ بات کے بارہ میں سنجیدہ نہ ہوں تو وہ اس کو کوئی اہمیت نہ دیں گے اور اپنے اپنے خیال کے مطابق اس کی مختلف تعبیریں کریں گے۔ کوئی ایک بات کہے گا، کوئی دوسری بات۔ اس طرح ان کی غیر سنجیدگی انھیں اختلاف رائے تک پہنچا دے گی۔

یہ صورت تمام پیغمبروں کے ساتھ پیش آئی۔ اس کے باوجود خدا اس کو گوارا کرتا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے موجودہ دنیا کو عمل کی جگہ بنایا ہے اور اگلی آنے والی دنیا کو بدلہ پانے کی جگہ۔ خدا کی یہی سنت ہے جس کی بنا پر لوگوں کو مکمل آزادی ملی ہوئی ہے۔ موجودہ صورت حال اسی مہلت امتحان کی بنا پر ہے نہ کہ خدا کے عجز یا لوگوں کے کسی استحقاق کی بنا پر۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُۥ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٢﴾ وَلَا تَرْكَنُوٓا۟ إِلَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ فَتَمَسَّكُمُ ٱلنَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ﴿١١٣﴾ وَأَقِمِ ٱلصَّلَوٰةَ طَرَفَىِ ٱلنَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ ٱلَّيْلِ ۚ إِنَّ ٱلْحَسَنَٰتِ يُذْهِبْنَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ ۚ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّٰكِرِينَ ﴿١١٤﴾ وَٱصْبِرْ فَإِنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿١١٥﴾

پس تم جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے اور وہ بھی جنھوں نے تمھارے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو بیشک وہ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور ان کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا، ورنہ تم کو آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں، پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے اور نماز قائم کرو دن کے دونوں حصوں میں اور رات کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاددہانی ہے یاددہانی حاصل کرنے والوں کے لئے اور صبر کرو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ۱۵ - ۱۱۲

دعوت حق کا ابتدائی استقبال نظر انداز کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد مخالفت شروع ہوتی ہے، یہاں تک کہ مخالفت اپنے آخری نقطہ پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ داعیوں کے لئے بڑا نازک وقت ہوتا

ہے۔ اس وقت ان کے درمیان دو قسم کے ذہن ابھرتے ہیں۔ کچھ لوگ جھنجھلا کر یہ چاہنے لگتے ہیں کہ مخالفین سے ٹکرا جائیں اور ان لوگوں سے قوت کے ذریعے نپٹیں جن کے لئے نظری دلائل بے اثر ثابت ہوئے ہیں۔ دوسرا ذہن وہ ہے جو یہ سوچتا ہے کہ مخاطبین کے لئے قابل قبول بنانے کی خاطر اپنی دعوت میں کچھ ترمیم کر لی جائے۔ دعوت کے ان اجزا کا ذکر نہ کیا جائے جن کو سن کر مخاطبین بگڑ جاتے ہیں۔

پہلا رویہ اگر حد سے تجاوز کرنا ہے تو دوسرا رویہ باطل سے مصالحت کرنا۔ اور یہ دونوں ہی اللہ کی نظر میں یکساں طور پر غلط ہیں۔ خاص طور پر دوسری چیز (قابل قبول بنانے کی خاطر تبدیلی) تو جرم کا درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے وہ حق کا اعلان ہے۔ اور مصالحت کی صورت میں حق کا واضح اعلان نہیں ہو سکتا۔

دعوت کی راہ میں جب بھی کوئی مشکل پیش آئے تو داعی کو چاہئے کہ خدا کی طرف زیادہ سے زیادہ رجوع کرے کیونکہ سب کچھ کرنے والا وہی ہے۔ خدا کی مدد ہی تمام مشکلات کے حل کا واحد یقینی ذریعہ ہے۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا أُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿١١٦﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّأَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿١١٧﴾

پس کیوں نہ ایسا ہوا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں ایسے اہل خیر ہوتے جو لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے روکتے۔ ایسے تھوڑے سے لوگ نکلے جن کو ہم نے ان میں سے بچا لیا۔ اور ظالم لوگ تو اسی عیش میں پڑے رہے جو انھیں ملا تھا اور وہ مجرم تھے۔ اور تیرا رب ایسا نہیں کہ وہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ اس کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں ۱۷-۱۱۶

یہاں پچھلوں سے مراد پچھلی امتیں، بالفاظ دیگر، پچھلی مسلم قومیں ہیں۔ قوم کا بگاڑ ہمیشہ اس طرح ہوتا ہے کہ دنیوی سامان جو خدا کی طرف سے انھیں اس لئے دیا گیا تھا کہ اس سے ان کے اندر شکر کا جذبہ ابھرے، وہ ان کے لئے سرمستی اور دنیا پرستی پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

ایسی حالت میں مسلم قوم کی اصلاح کے لئے جو کام کرنا ہے اس کا عنوان شریعت کی اصطلاح میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ یہ حکم ایک مسلمان کی اس ذمہ داری کو بتاتا ہے جو اپنے قریبی ماحول کی اصلاح کے سلسلے میں اس پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں ہمیشہ ایسے افراد موجود رہنے چاہئیں جو مسلمانوں کو خدا اور آخرت کی یاد دلائیں۔ وہ ان کے اخلاق کی نگرانی کریں۔ وہ معاملات میں

ان کو راہ راست پر قائم رکھنے کی کوشش کریں۔

کسی قوم میں ایسے اہل خیر کا نہ نکلنا ہمیشہ دو سبب سے ہوتا ہے۔ یا تو پوری قوم کی قوم بگڑ چکی ہو اور اس میں کوئی صالح انسان باقی نہ رہا ہو۔ یا صالح افراد موجود تو ہوں مگر عمومی بگاڑ کی وجہ سے وہ زبان کھولنے کی ہمت نہ کرتے ہوں۔ انھیں اندیشہ ہو کہ اگر انھوں نے سچی بات کہی تو قوم کے درمیان وہ بے عزت ہو کر رہ جائیں گے۔

مذکورہ دونوں صورتوں میں قوم خدا کی نظر میں اپنا اعتبار کھو دیتی ہے اور اس کی مستحق ہو جاتی ہے کہ ایک یا دوسری صورت میں وہ عذاب خداوندی کی زد میں آ جائے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اور اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے، سوا ان کے جن پر تیرا رب رحم فرمائے۔ اور اس نے اسی لئے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے اکٹھے بھر دوں گا ۱۹ — ۱۱۸

ہماری دنیا میں انسان کے سوا دوسری بے شمار مخلوقات بھی ہیں۔ یہ سب ہمیشہ فطرت کے ایک ہی مقرر راستہ پر چلتی ہیں۔ اسی طرح انسان کو بھی خدا ایک ہی صراط مستقیم کا پابند بنا سکتا تھا۔ مگر انسان کے بارہ میں خدا کی یہ اسکیم ہی نہیں۔ انسان کے سلسلہ میں خدا کا منصوبہ یہ تھا کہ ایک ایسی مخلوق پیدا کی جائے جو خود اپنے آزادانہ اختیار کے تحت ایک چیز کو لے اور دوسری چیز کو چھوڑ دے۔ انسان کی دنیا میں اختلاف (کسی کا ایک راستہ پر چلنا اور کسی کا دوسرے راستہ پر) دراصل اسی خاص خدائی منصوبہ کی بنا پر ہے۔

یہ منصوبہ یقیناً ایک پرخطر منصوبہ تھا کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ بہت سے لوگ آزادی کا غلط استعمال کر کے اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنا لیں گے۔ مگر اسی پرخطر منصوبہ کے ذریعے وہ اعلیٰ روحیں بھی چنی جا سکتی تھیں جو خدا کی رحمت خاص کی مستحق قرار پائیں۔ خدا نے اپنی رحمتیں ساری کائنات کو بطور عطیہ دے رکھی ہیں۔ اب خدا نے یہ منصوبہ اس لئے بنایا تاکہ اپنی رحمت وہ اپنی ایک مخلوق کو یہ کہہ کر دے کہ یہ تمہارا حق ہے۔

خدا کی رحمت اس شخص کو ملتی ہے جس کا شعور اتنا بیدار ہو گیا ہو کہ وہ امتحانی اختیار کے اندر اپنی حقیقی بے اختیاری کو جان لے۔ وہ انسانی قدرت کے پردہ میں خدا کی قدرت کو دیکھ لے۔ یہ شعور ایسے

آدمی سے سرکشی کی طاقت چھین لیتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ جب خدا اپنی رحمت کو اس کا حق کہہ کر پیش کرے تو اس کا شعور حقیقت پکار اٹھے ———— خدایا یہ بھی تیری رحمتوں ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ ورنہ میرا عمل تو کسی قیمت کا مستحق نہیں۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور ہم رسولوں کے احوال سے سب چیزیں تمھیں سنا رہے ہیں۔ جس سے تمھارے دل کو مضبوط کریں اور اس میں تمھارے پاس حق آیا ہے اور مومنوں کے لئے نصیحت اور یاددہانی۔ اور جو لوگ ایمان نہیں لائے ان سے کہو کہ تم اپنے طریقہ پر کرتے رہو اور ہم اپنے طریقہ پر کر رہے ہیں۔ اور انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہیں۔ اور آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اللہ کے پاس ہے اور وہی تمام امور کا مرجع ہے۔ پس تم اس کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو اور تمھارا رب اس سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو ۱۲۳ - ۱۲۰

قرآن میں رسولوں کے احوال اس لئے سنائے گئے ہیں کہ بعد کے داعیوں کو اس سے سبق حاصل ہو۔ رسولوں کے احوال میں داعی دیکھتا ہے کہ ان کی مخاطب قوموں نے ان سے جھگڑے کئے۔ سیدھی بات کو غلط رخ دے کر انھیں مطعون کیا۔ ان کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ ان کو اس طرح رد کر دیا جیسے ان کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

مگر بالآخر اللہ نے ان کی مدد کی۔ ان کی بات سب سے برتر ثابت ہوئی۔ مخالفین کی تمام کارروائیاں ناکام ہو کر رہ گئیں۔ دونوں گروہوں کا یہ مختلف انجام اپنی ابتدائی صورت میں موجودہ دنیا ہی میں پیش آیا اور آخرت میں وہ اپنی کامل ترین صورت میں پیش آئے گا۔

ان مثالوں سے داعی کو یہ تاریخی اعتماد حاصل ہوتا ہے کہ اس کو دعوت حق کی راہ میں جو مشکلیں پیش آرہی ہیں ان میں اس کے لئے نہ مایوسی کا سوال ہے اور نہ گھبراہٹ کا۔ دعوت حق کی راہ میں یہ چیزیں ہمیشہ پیش آتی ہیں۔ اور اس کو بھی بالآخر اسی طرح کامیابی حاصل ہوگی جس طرح اس سے پہلے خدا کے سچے داعیوں کو حاصل ہوئی۔

تاریکی میں سفر

لندن کے اخبار گارجین (۱۳؍مارچ ۱۹۸۳) کے ایک تین کالمی مضمون کی سرخی ہے ——— تاریکی میں ایک بہادرانہ سفر:

A brave journey through the dark.

یہ مضمون آرتھر کوئسلر (Arthur Koestler) کے بارہ میں ہے۔ آرتھر کوئسلر انگلستان کا ایک مشہور ادیب اور مفکّر تھا۔ اس نے اور اس کی بیوی سنتھیا (Cynthia) نے مارچ ۱۹۸۳ میں اپنے لندن کے مکان میں خودکشی کر لی۔ موت کے وقت آرتھر کوئسلر کی عمر ۷۷ سال تھی۔

آرتھر کوئسلر بہت سی کتابوں کا مصنف تھا۔ اس کی ایک کتاب کا نام ہے ——— دوپہر میں تاریکی (Darkness at Noon) یہ کتاب ۳۲ زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب کمیونزم کے خلاف ہے۔ اس میں مصنّف نے دکھایا ہے کہ نام نہاد عوامی نظام میں بھی کس طرح انسان کے اوپر انسان کا ظلم جاری رہتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کا استغلال کرتا ہے۔

آرتھر کوئسلر کو ذاتی طور پر وہ تمام دنیوی چیزیں حاصل تھیں جن کی ایک انسان تمنا کرتا ہے۔ وہ مشہور عالم تھا۔ اپنے پیچھے اس نے چار لاکھ پونڈ چھوڑے ہیں جن کے بارہ میں اس نے وصیت کی کہ وہ ایک برطانی یونیورسٹی کو دے دیے جائیں جو اس رقم کو (Parapsychology) کی تحقیق میں لگائے۔

آرتھر کوئسلر نے کیوں خودکشی کر لی۔ اس کی وجہ اس کی مایوسی تھی۔ وہ دنیا میں بُرائیاں دیکھ کر بے حد پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان بُرائیوں کی کیا توجیہہ کرے۔ ۱۹۷۴ میں اس کے مقالات کا ایک مجموعہ چھپا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ تکنیکی ترقیوں اور اخلاقی سلوک کے درمیان بہت نمایاں قسم کی علامتی نابرابری پائی جاتی ہے:

> There is a striking, symptomatic disparity between the growth-curves of technological achievement on the one hand and of ethical behaviour on the other.

اس کے بعد وہ جدید تہذیب سے اپنی مایوسی کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے کہ ہم دور دراز سیّاروں کے گرد گھومنے والے خلائی جہازوں کی حرکت کو کنٹرول کر سکتے ہیں مگر شمالی آئرلینڈ کے حالات پر کنٹرول کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں:

We can control the motions of the satellites, orbiting the distant planets, but can not control the situation in Northern Ireland.

جانور اپنی نوع کو ہلاک نہیں کرتے۔ مگر انسان خود اپنے ہم جنسوں کو ہلاک کرتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس سوال کی تحقیق کرتے ہوئے آرتھر کوئسلر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی دماغ کے مختلف حصوں میں ارتقا ر کے دوران عدم توازن (Imbalance) پیدا ہوگیا ہے۔ یہی عدم توازن مردم کشی کے بڑے بڑے واقعات کا اصل سبب ہے۔

تاہم یہ تحقیقات اس کو سکون نہ دے سکیں۔ وہ بالآخر اس رائے پر پہنچا کہ انسان کے لئے موجودہ حالات میں سب سے بہتر بات یہ ہے کہ وہ خودکشی کرلے۔ اس کا آخری فلسفہ یہ تھا کہ موت اس شخص کے لئے قابل استقبال اور قدرتی ریلیف ہوسکتی ہے جس کا واحد بدل غم اور مصیبت ہو:

Death could be a welcome and natural relief for someone whose only alternative was pain and suffering.

The Guardian (London) March 13, 1983

آرتھر کوئسلر نے اپنے اس نظریہ پر خود عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس دنیا سے الگ کرلیا جو نہ اس کی مرضی کے مطابق تھی اور نہ وہ اس کو بدلنے کی قدرت رکھتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ انسان ایک روشن فضا میں آنکھ کھولتا ہے پھر وہ موت کی اندھیری دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ٹکنالوجی میں غیر معمولی ترقی کے باوجود انسان کی اخلاقی ترقی ممکن نہ ہوسکی۔ اس نے دیکھا کہ آدمی خلا میں گھومنے والی مشین کو کنٹرول کرلیتا ہے۔ مگر انسان کو کنٹرول کرنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ اس نے دیکھا کہ جانور تک اپنے ہم جنسوں کو ہلاک نہیں کرتے مگر انسان خود اپنے ہم جنسوں کو ہلاک کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ انسان اپنے سارے وسائل کو استعمال کرکے فلاحی نظام بناتا ہے مگر وہ نظام روشنی میں تاریکی کے ہم معنی ہوجاتا ہے۔ ان حالات نے اس کو مایوس کردیا اور اس نے خودکشی کرلی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے آخرت کا تصور نہ ہو تو اس کی زندگی کتنی بے معنی ہوجاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کی معنویت اسی وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہ اس کو آخرت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے۔ آخرت کے بغیر یہ دنیا اتنی بے معنی معلوم ہوتی ہے کہ ایک حساس مفکر یہی کرسکتا ہے کہ وہ خودکشی کرلے تاکہ اس کے خیال کے مطابق اس کو موجودہ ناقابل فہم دنیا سے چھٹی مل جائے۔

قدردانی

خلیفہ عبدالحکیم ابتدائً عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد میں شعبہ فلسفہ کے صدر تھے۔ وہ طویل رخصت پر انگلستان گئے تو یہ جگہ خالی ہوگئی۔ مولانا عبدالباری ندوی (۱۸۹۰-۱۹۷۶) قائم مقام صدر کی حیثیت سے اس عہدہ پر مقرر کیے گئے۔ مولانا عبدالباری ندوی نے پرائیوٹ طور پر انگریزی پڑھی تھی۔ مگر سند کے اعتبار سے ان کے پاس میٹرک کی سند بھی نہ تھی۔ ان کے تقرر میں خاص طور پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا حصہ تھا جو اس وقت حیدرآباد میں صدرالصدور تھے۔ مولانا عبدالباری ندوی حیدرآباد میں ۱۹۲۲ سے لے کر ۱۹۴۵ تک رہے۔ اس زمانہ کا ایک واقعہ وہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔

"حیدرآباد میں میری ملازمت کے دو سال گذر جانے کے بعد حسب قاعدہ استقلال کی کارروائی پیش ہوئی۔ اس زمانہ میں حیدرآباد میں گزیٹڈ پوسٹ پر استقلال کے لیے خود اعلیٰ حضرت کی منظوری ضروری تھی۔ ابھی غالباً کارروائی اعلیٰ حضرت تک پہنچی بھی نہ تھی کہ ڈیوڑھی میں (شروانی صاحب کے کسی مہربان) نے اعلیٰ حضرت کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ شروانی صاحب نے فلسفہ کا صدر ایسے شخص کو بنوا دیا ہے جس کو فلسفہ تو کیا سرے سے کوئی ادنیٰ سند بھی حاصل نہیں۔ اعلیٰ حضرت نے شیروانی صاحب سے جواب طلب کر لیا۔ شیروانی صاحب نے میرا رسالہ "مذہب اور عقلیات" کے ساتھ اپنا عریضہ منسلک کر کے یہ تحریر فرمایا کہ ان کی سند یہ ہے کہ فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے۔ جس کا اندازہ سرکار خود رسالہ ہٰذا کی چند سطروں سے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے استقلال کی کارروائی پر اپنے دستخط کر دیئے۔"

علامہ اقبال (م ۱۹۳۸) کا واقعہ ہے کہ اس زمانہ کے گورنر پنجاب سر ایڈورڈ میکلیگن نے ایک بار ان سے دریافت کیا "کیا آپ کے خیال میں کوئی ایسا موزوں شخص ہے جس کو حکومت کی طرف سے شمس العلمار کا خطاب دیا جائے"۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے مولوی میر حسن کا نام تجویز کیا جو اس وقت مرے کالج سیالکوٹ میں استاد تھے۔ گورنر نے کہا "میں نے ان کا نام آج پہلی بار آپ کی زبان سے سنا ہے۔ کیا مولوی صاحب نے کوئی کتاب بھی لکھی ہے"۔ علامہ اقبال نے جواب دیا "ان کی لکھی ہوئی تصنیف تو نہیں۔ البتہ ان کی ایک زندہ تصنیف ضرور موجود ہے"۔ گورنر نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ زندہ تصنیف کیا ہے"۔ علامہ اقبال نے کہا "میں ان کی زندہ تصنیف ہوں، وہ میرے محترم استاد ہیں"۔ گورنر اس جواب سے بہت خوش ہوا۔ اور جلد ہی ایک سادہ تقریب میں مولوی میر حسن کو شمس العلمار کا خطاب دے دیا گیا۔

عقل کا استعمال

ایک صاحب پرنٹنگ پریس کا کام کرتے تھے۔ انھوں نے دہلی کے ایک سفارت خانہ کو اپنے کام سے اتنا گرویدہ بنالیا کہ لمبے عرصہ تک اس سفارت خانہ نے اپنا چھپائی کا کام ان کے سوا کسی دوسرے پریس کو نہیں دیا۔

کوئی شخص جب پریس میں چھپنے کے لئے کتاب دیتا ہے تو اصل کتاب چھپنے سے پہلے پریس اس کو اس کا پروف دکھاتا ہے۔ پروف عام طور پر معمولی ڈھنگ سے بڑے بڑے کاغذ پر نکالے جاتے ہیں۔ اور منتشر اوراق کی صورت میں ناشر کو دے دئے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ پروف اصل چھپی ہوئی کتاب کا نہایت ناقص نمونہ ہوتے ہیں۔ ان سے چھپائی کی صحت اور غلطی تو معلوم کی جاسکتی ہے۔ مگر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کتاب چھپنے کے بعد کیسی ہوگی۔

مذکورہ پریس کے مالک کو پہلی بار سفارت خانہ سے ایک کتاب چھاپنے کو ملی تو انھوں نے پروف پیش کرنے کا نیا انداز اختیار کیا۔ انھوں نے تمام اوراق باقاعدہ پریس میں چھاپ کر نکالے ان کو عام طریقہ کے خلاف دونوں طرف چھاپا۔ اس طرح پوری کتاب کا ہر فارم اچھے کاغذ پر چھاپ کر اس کو کتاب کی طرح موڑا اور اس کی جلد بندی کرا کے پوری کتاب کا ایک پیشگی نمونہ تیار کر دیا۔ انھوں نے پروف کے بجائے یہ کتاب سفارت خانہ کے سامنے پیش کی۔ سفارت خانہ کے ذمہ دار اس باقاعدگی کو دیکھ بہت خوش ہوئے اور اپنا چھپائی کا تمام آڈر ان کے حوالے کر دیا۔

چند سال کے بعد ایسا ہوا کہ کسی دوسرے پریس نے سفارت خانہ والوں سے کہا کہ جس پریس سے آپ چھپواتے ہیں وہ آپ سے زیادہ دام چارج کرتا ہے۔ آپ ہم کو اپنی فرمائش دیں، ہم کم نرخ پر ویسی ہی کتاب چھاپ کر آپ کو دیں گے۔ سفارت خانہ والے اس کے کہنے میں آگئے اور آزمائشی طور پر ایک کتاب کی چھپائی کا کام اس کے حوالے کر دیا۔ کچھ دنوں بعد جب پریس کی طرف سے کتاب کے پروف آئے تو وہ عام قاعدہ کے مطابق معمولی کاغذ کے ایک پلندے کی صورت میں تھے۔ نیز زیادہ اہتمام نہ کرنے کی وجہ سے چھپائی بھی ویسی نہ تھی جیسی اصل کتاب کی ہوتی ہے۔ یہ پروف جب سفارت خانہ کے ذمہ دار کے سامنے آئے تو وہ ان کو دیکھ بگڑ گیا۔ وہ سمجھا کہ کتاب کی چھپائی کا معیار بھی یہی ہوگا۔ اس نے اس کو نااہل سمجھ کر اس کو دیا ہوا آڈر منسوخ کر دیا اور دوبارہ سابق پریس سے فرمائش کی کہ وہ اس کا کام کرے۔ اگر آپ کے اندر کوئی جوہر ہے تو اس کی قیمت بہر حال آپ کو مل کر رہے گی۔

جتنا دینا اتنا پانا

مسٹر سرجیت سنگھ لانبہ (پیدائش ۱۹۳۱) عکسی حافظہ (Photographic Memory) کے مالک ہیں۔ کسی چیز کو چند بار پڑھ لیں تو وہ ان کو یاد ہو جاتی ہے۔ ۱۲ جون ۱۹۸۳ کو وہ ہمارے دفتر میں آئے تو الرسالہ کے کئی مضمون انھوں نے لفظ بلفظ زبانی سنا دئے۔

مسٹر لانبہ وزارت قانون میں ہیں اور دہلی میں کرتی نگر میں رہتے ہیں۔ وہ اقبال کے شیدائی ہیں۔ اقبالیات کے موضوع سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔ اقبال کے ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد ہیں۔ اور اسی طرح ان کی زندگی کے حالات بھی۔

مسٹر سرجیت سنگھ لانبہ مئی ۱۹۸۳ میں پاکستان گئے۔ وہاں اقبالیات کے ماہر کی حیثیت سے ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ اس سلسلے میں ان کی ملاقات امیر حسین صاحب (لاہور) سے ہوئی۔ انھیں بھی اقبال کے اشعار کثرت سے یاد ہیں۔ انھوں نے مسٹر لانبہ کو چیلنج کیا اور کہا کہ اگر تم ثابت کردو کہ تم کو مجھ سے زیادہ اقبال کے اشعار یاد ہیں تو میں اپنی ہار مان لوں گا اور تم کو پانچ ہزار روپے انعام دوں گا۔ مسٹر لانبہ نے کہا:

میں پچھلے دس سال سے شمع اقبال پر پروانے کی طرح رقص کر رہا ہوں۔ تم مجھ سے زیادہ اقبال کا کلام اسی وقت پیش کر سکتے ہو جب کہ تم نے پروانہ بن کر شمع اقبال پر مجھ سے زیادہ رقص کیا ہو۔ چنانچہ مسٹر سرجیت سنگھ لانبہ مقابلہ میں جیت گئے۔ امیر حسین صاحب اقبال کی جس نظم کا کوئی مصرعہ پڑھتے مسٹر لانبہ مسلسل اس کے آگے کے اشعار سنانا شروع کر دیتے۔ اس کے برعکس جب مسٹر لانبہ نے اقبال کا کوئی مصرعہ پڑھا تو وہ اس کے آگے زیادہ نہ سنا سکے۔

اقبالیات کے مقابلہ میں سرجیت سنگھ لانبہ جیت گئے اور امیر حسین لاہوری ہار گئے۔

کسی میدان میں کامیابی کی سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ اس میدان میں آدمی اپنے آپ کو وقف کر دے۔ زندگی کا ہر معاملہ گویا ایک شمع ہے۔ اور اس معاملہ میں وہی شخص سب سے زیادہ آگے بڑھے گا جو سب سے زیادہ اس شمع کے لئے تڑپا ہو، جس نے سب سے زیادہ اس شمع کے لئے رقص کیا ہو۔

زندگی لین دین کا سودا ہے۔ یہاں دینے والا پاتا ہے۔ اور اتنا ہی پاتا ہے جتنا اس نے دیا ہو۔ یہاں نہ دئے بغیر پانا ممکن ہے اور نہ یہی ممکن ہے کہ کوئی شخص کم دے کر زیادہ کا حصہ دار بن جائے۔

ایمان والے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لئے جب مکہ کے حالات سخت ہو گئے تو آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر مدینہ چلے گئے جس کو ہجرت کہا جاتا ہے۔ مکہ سے جو لوگ آئے تھے وہ مدینہ میں بالکل اجنبی تھے۔ چنانچہ ان کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ مکہ کے مسلمانوں (مہاجرین) اور مدینہ کے مسلمانوں (انصار) کے درمیان مواخاۃ قائم کی گئی۔ یعنی مکہ سے آنے والے ہر شخص کو مدینہ میں رہنے والے کسی شخص کا بھائی بنا دیا گیا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ایک مہاجر تھے۔ ان کی مواخاۃ حضرت سعد بن ربیع انصاری سے ہوئی۔ سعد بن ربیع مدینہ میں اس وقت کے لحاظ سے ایک مالدار شخص تھے۔ انھوں نے پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنے مہاجر دینی بھائی کو واقعی بھائی کی طرح قبول کر لیا۔

حضرت سعد بن ربیع انصاری نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ میرے پاس جو مال ہے وہ سب میرے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔ میں اس کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ اور میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ دونوں میں سے جو حصہ تم کو زیادہ اچھا معلوم ہو اس کو تم لے لو (وا ستحلفك ان تاخذ خير الحصتين)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اپنے انصاری بھائی کی زبان سے یہ سنا تو انھوں نے ان کو دعا دی اور اس کے بعد کہا کہ تمہارا جذبہ بہت مبارک ہے، اللہ تعالیٰ تمھیں اس کی جزائے خیر دے۔ مگر میں ایک ایسا شخص ہوں جس کو تجارت کرنا آتا ہے۔ اس لئے تم میرے لئے صرف یہ کرو کہ مجھ کو بازار کا راستہ بتا دو (انی رجل له حظ فی التجارة فدلنی الی السوق)

حضرت سعد بن ربیع انصاری کے لئے موقع تھا کہ وہ اپنے مال کا زیادہ حصہ کسی نہ کسی تدبیر سے اپنے لئے مخصوص کر لیتے اور کچھ حصہ اپنے مہاجر بھائی کو دے دیتے۔ اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ایسا کر سکتے تھے کہ ان کے انصاری بھائی نے جب اپنا نصف مال انھیں پیش کر دیا تو وہ فوراً اس کو لے لیتے۔ مگر دونوں نے وہ کیا جو ان کا ایمان اور تعلق باللہ ان سے تقاضا کر رہا تھا۔

انصاری مسلمان نے اپنے مال کا نصف حصہ مہاجر مسلمان کو پیش کر دیا۔ دوسری طرف مہاجر مسلمان نے اپنے انصاری بھائی کو دعا دیتے ہوئے اپنی محنت پر بھروسہ کیا۔ ایک کا جذبۂ ایمان ہمدردی کی صورت میں ظاہر ہوا اور دوسرے کا خود اعتمادی کی صورت میں۔

احسن تقویم

قرآن کی سورہ نمبر ۹۵ (التین) میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو خدا نے احسن تقویم (بہترین ساخت) پر پیدا کیا ہے۔ مگر اس کے بعد خدائی نقشہ کے خلاف چلنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سب سے نچلے مقام پر جاگرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کیا ہے اور دنیا میں اس کا امتحان کس اعتبار سے لیا جا رہا ہے۔ انسان اپنی پیدائشی بناوٹ کے اعتبار سے جنت کا شہری ہے۔ وہ خدا کا وہی مطلوب انسان ہے جس کو وہ اپنی خصوصی نعمتوں کی دنیا میں بسانا چاہتا ہے۔ انسان عملاً وہی ہے جو اس کو ہونا چاہئے۔

پھر انسان کا امتحان کیا ہے۔ اس کا امتحان یہ ہے کہ دنیا میں آزادانہ ماحول پا کر وہ بگڑ نہ جائے۔ وہ اپنے آپ کو اسی حال میں بچا کر رکھے جس حال میں خدا نے اس کو ابتداءً پیدا کیا تھا۔ وہ اپنے شعور کو خدا کے تخلیقی نقشہ کا چوکیدار بنالے۔

جو لوگ ایسا کریں کہ خدا نے جس شخصیت کے ساتھ انھیں پیدا کیا تھا اسی شخصیت کو لئے ہوئے وہ خدا تک پہنچیں، وہ خدا کی جنت کے باشندے قرار دئے جائیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ خدا کی بنائی ہوئی شخصیت کو محفوظ نہ رکھ سکیں وہ جنّت میں بسنے کیلئے نااہل ٹھہریں گے۔ وہ کائناتی کوڑا خانہ میں پھینک دئے جائیں گے۔

مثال کے طور پر خدا کی تخلیق کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے انسان کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے (الاحزاب) اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی تخلیقی اسکیم میں دوعملی کی کوئی گنجائش نہیں۔ دو دل والا انسان خدا کی پسند کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اب جو شخص ایسا کرے کہ اپنے ذہن میں متضاد افکار کو جمع کرے۔ مثلاً وہ ایک خدا کی بڑائی کا اقرار کرے اور اسی کے ساتھ وہ انسان کی بڑائی میں گم ہو۔ وہ ایسی زندگی گزارے جس میں اپنوں کے لئے کچھ ہو اور غیروں کے لئے کچھ۔ جہاں مفاد کا لالچ یا دباؤ کی مجبوری ہو وہاں وہ ایک رویہ اختیار کرے، اور جہاں مفاد یا دباؤ کا پہلو نہ ہو وہاں وہ بالکل دوسرا انسان بن جائے۔

جس آدمی نے اپنے فکر و عمل کے لئے اس قسم کے دو معیار بنا رکھے ہوں وہ گویا احسن تقویم پر قائم نہیں۔ وہ خدا کی امانت کا نگہبان نہ بن سکا۔ اس نے خدا کی دی ہوئی شخصیت کو داغدار کر لیا۔ ایسا آدمی قرآن کے الفاظ میں اسفل سافلین میں پھینک دیا جائے گا۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے آپ کو دوعملی اور تضاد فکری سے بچاتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو، وہ گویا خدا کے یہاں وہی "انسان" لے کر پہنچا جو خدا نے اپنے منصوبہ کے تحت اسے دیا تھا، ایسا آدمی جنّت کے باغوں میں داخل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ خدا کے یہ ابدی باغ ایسے ہی لوگوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔

کائناتی نشانیاں

عن ابن عباس قال اتت قریش الیھود فقالوا بم جاءکم موسٰی قالوا عصاہ و یدہ بیضاء للنّٰظرین واتوا النصاریٰ فقالوا کیف کان عیسٰی۔ قالوا کان یبرئ الاکمہ والابرص ویحیی الموتٰی فاتوا النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقالوا ادع اللّٰہ ان یجعل لنا الصفا ذھباً فدعا ربہ فنزلت ھذہ الآیۃ (انّ فی خلق السمٰوات والارض واختلاف الیل والنہار لاٰیات لاولی الالباب) فلیتفکروا فیھا۔

تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۴۳۸

حضرت عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ قریش یہود کے پاس آئے اور پوچھا کہ موسیٰ تمھارے پاس کیا معجزہ لے کر آئے انھوں نے کہا کہ اپنا عصا اور اپنا ہاتھ جو دیکھنے والوں کو چمک دار نظر آتا تھا۔ پھر قریش نصاریٰ کے پاس آئے اور پوچھا کہ عیسیٰ کا معاملہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتے تھے اور مردہ کو زندہ کرتے تھے۔ پھر قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ آپ خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے صفا پہاڑ کو سونا بنا دے۔ پھر آپ نے اپنے رب سے دعا کی تو یہ آیت اتری: "بے شک آسمانوں اور زمینوں کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں"، پس سوال کرنے والوں کو چاہئے کہ اس میں غور کریں۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لقد نزلت علیّ اللیلۃ آیۃ ویل لمن قرأھا ولم یتفکر فیھا (ان فی خلق السماوات والارض الخ)

البقرہ ۱۶۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج کی رات میرے اوپر ایک ایسی آیت اتری ہے کہ خرابی ہے اس کی جو اس کو پڑھے اور اس میں غور نہ کرے۔ وہ آیت یہ ہے: بے شک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور جہازوں میں جو سمندر میں چلتے ہیں لوگوں کے نفع کی چیزیں لے کر اور پانی میں جس کو اللہ نے اوپر سے اتارا پھر اس سے زمین کو موت کے بعد زندہ کر دیا اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید

رہتا ہے، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔

عن ابی ذر قال تركنا رسول الله صلى الله عليه وسلم وما طائر يقلب جناحيه في الهواء الا وهو يذكر لنا منه علما
(تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۴۰۴)

حضرت ابو ذر کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا اور آپ کا حال یہ تھا کہ اگر ایک چڑیا بھی فضا میں اپنے پر ہلاتی تھی تو اس سے آپ ہم کو کسی علم کی یاد دہانی کراتے تھے۔

قال الدارانی انی لاخرج من منزلی فما يقع بصری علی شیٔ الا رأيت لله علیّ فيه نعمة ولی فيه عبرة (تفسیر ابن کثیر)

حضرت دارانی کہتے ہیں کہ میں اپنے گھر سے نکلتا ہوں تو جس چیز پر بھی میری نگاہ پڑتی ہے۔ مجھے اس میں خدا کی کوئی نعمت نظر آتی ہے اور اس میں میرے لئے کوئی عبرت ہوتی ہے۔

عن جابر رضی الله عنه قال خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال، يا ايها الناس ان لله سرايا من الملائكة تحل وتقف على مجالس الذكر في الارض فارتعوا في رياض الجنة۔ قالوا واين رياض الجنة، قال مجالس الذكر۔ فاغدوا او روحوا في ذكر الله واذكروه بانفسكم۔ من كان يحب ان يعلم منزلته عند الله فلينظر كيف منزلة الله عنده فان الله ينزل العبد منه حيث انزله من نفسه (البیہقی)

حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے لوگو، اللہ کے لئے فرشتوں کی جماعت ہے جو زمین پر ہونے والی ذکر کی مجلسوں میں آتی ہے اور ٹھہرتی ہے۔ لہٰذا تم جنت کے باغوں میں چرو۔ لوگوں نے کہا کہ جنت کے باغ کہاں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ذکر کی مجلسیں ہیں لہٰذا تم اللہ کی یاد میں صبح کرو یا اللہ کی یاد میں شام کرو۔ اور اللہ کو اپنے جی میں یاد کرو۔ جس آدمی کو پسند ہو کہ اللہ کے پاس اپنے مرتبہ کو جانے اس کو چاہئے کہ یہ دیکھے کہ اللہ کا مرتبہ اس کے پاس کیا ہے۔ کیونکہ اللہ بندہ کو اپنے یہاں وہی درجہ دیتا ہے جو درجہ بندہ نے اپنے یہاں اللہ کو دیا ہے۔

دو امکانات کے درمیان

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جب دعا فرماتے تو اکثر اس قسم کے الفاظ فرماتے: یا مقلّب القلوب ثبت قلبی علیٰ دینك (اے دلوں کے پھیرنے والے، میرے دل کو اپنے دین پر جما دے) حضرت عائشہ نے ایک روز سنا تو کہا: اے خدا کے رسول! آپ یہ دعا بہت کرتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے۔ آپ نے فرمایا:

ہر آدمی کا دل اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلی کے درمیان ہوتا ہے۔ جب وہ اس کو سیدھا کرنا چاہتا ہے تو سیدھا کر دیتا ہے اور جب وہ اس کو ٹیڑھا کرنا چاہتا ہے تو ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ (لیس من قلب الا وھو بین اصبعین من اصابع الرّحمٰن، اذا شاء ان یقیمہ اقامہ وان شاء یزیغہ ازاغہ)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی شخص گمراہی کے خطرہ سے خالی نہیں۔ ہر آدمی کو مسلسل اپنے ایمان کی حفاظت کرنی ہے۔ ہر آن اللہ سے یہ توفیق مانگنی چاہئے کہ وہ اس کو پھسلنے سے بچائے۔ جس لمحہ اللہ کی توفیق آدمی کا ساتھ چھوڑ دے گی اسی لمحہ وہ گمراہی کی وادی میں بھٹک جائے گا۔ آدمی ہر آن ہدایت اور گمراہی کے درمیان ہے اور صرف اللہ کی مدد ہی اس کو ہدایت پر قائم رکھ سکتی ہے۔

زبان اور دل سب سے اچھے بھی ہیں اور سب سے خراب بھی

لقمان حکیم ایک حبشی غلام تھے۔ ان کے آقا نے ایک روز ان سے کہا کہ ایک بکری ذبح کرو اور اس میں سے دو بہترین گوشت کے ٹکڑے نکالو۔ لقمان نے بکری ذبح کی اور زبان اور دل نکال کر آقا کے سامنے پیش کیا۔ کچھ دن کے بعد آقا نے دوبارہ کہا کہ ایک بکری ذبح کرو اور اس میں سے دو سب سے زیادہ خراب گوشت کے ٹکڑے نکالو۔ لقمان نے بکری ذبح کی اور دوبارہ زبان اور دل نکال کر آقا کے سامنے رکھ دیا۔ آقا نے کہا میں نے تم سے دو سب سے اچھے ٹکڑے نکالنے کو کہا تو تم نے زبان اور دل نکالے اور جب میں نے تم سے دو سب سے خراب ٹکڑے نکالنے کو کہا تب بھی تم نے زبان اور دل نکالے۔ ایسا کیوں۔ لقمان حکیم نے جواب دیا: اگر یہ دونوں درست ہوں تو ان سے بہتر کوئی چیز نہیں اور اگر یہ دونوں بگڑ جائیں تو ان سے زیادہ خراب کوئی چیز نہیں (انّہ لیس من شئ اطیب منھما اذا طابا ولا اخبث منھما اذا خبثا)

پیغمبر کی اطاعت ہر حال میں

حضرت مغیرہ بن شعبہ نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ میں فلان

شخص کی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ پہلے جا کر اس کو دیکھ لو۔ وہ گئے اور لڑکی کے والدین سے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا پیغام سنایا۔ والدین کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ ان کی لڑکی ایک غیر شخص کے سامنے آئے اور وہ اس کو دیکھے۔ لڑکی اس وقت گھر کے اندر موجود تھی، اور پردہ کے پیچھے سے یہ باتیں سُن رہی تھی۔ اس نے بلند آواز سے کہا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حکم دیا ہے تو تم آ کر مجھ کو دیکھ لو۔ اور اگر آپ نے حکم نہیں دیا ہے تو میں تم کو خدا کی قسم دلاتی ہوں کہ ہرگز ایسا مت کرنا (سنن ابن ماجہ، باب النکاح)

کلمۂ اسلام کی حقیقت اخلاص اور تقویٰ ہے

حضرت عثمان بن عفّان کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ جو بندہ بھی اس کو واقعی اپنے دل سے کہے وہ آگ پر حرام ہو جائے گا حضرت عمر فاروق نے کہا کہ میں تم کو بتاؤں کہ وہ کلمہ کیا ہے۔ وہ اخلاص کا کلمہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب پر لازم کیا تھا۔ وہ تقویٰ کا کلمہ ہے جس کی تلقین اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلّم نے اپنے چچا ابو طالب کو موت کے وقت کی تھی۔ وہ اس بات کی گواہی دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (اخرج احمد عن عثمان بن عفّان قال سمعت رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم یقول: انّی لاعلم کلمۃ لایقولھا عبد حقا من قلبہ الاحرم علی النار۔ قال عمر بن الخطاب انا احدثک ماھی۔ ھی کلمۃ الاخلاص التی الزمھا اللّٰہ تعالیٰ محمّداً صلّی اللّٰہ علیہ وسلم واصحابہ وھی کلمۃ التقوی التی الاص علیھا نبی اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم عمّہ ابا طالب عند الموت شھادۃ ان لا الٰہ الّا اللّٰہ)

ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی غیبی حقیقتوں کو دیکھنے لگے

حضرت مالک بن انس کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس آئے۔ آپ نے پوچھا کہ اے معاذ، تم نے کیسے صبح کی (کیف اصبحت یا معاذ) انھوں نے کہا کہ میں نے اللہ پر ایمان کے ساتھ صبح کی۔ آپ نے فرمایا کہ ہر قول کا ایک مصداق ہوتا ہے اور ہر قول کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ پھر جو کچھ تم کہتے ہو اس کا مصداق کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول میں نے کبھی کوئی ایسی صبح نہیں کی جس میں مجھے یہ خیال نہ لگا ہوا ہو کہ اب میں شام نہ کر سکوں گا۔ اور کبھی میں نے کوئی ایسی شام نہیں کی جس میں مجھے یہ خیال نہ ہو کہ میں صبح نہ کر سکوں گا۔ اور میں نے کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جس میں مجھے یہ خیال نہ ہو کہ میں دوسرا قدم نہ اٹھا سکوں گا۔ اور گویا کہ میں گھٹنوں کے بل گری ہوئی ان تمام امتوں کو دیکھ

رہا ہوں جن کو اپنے اعمال نامہ کی طرف بلایا جا رہا ہے اور ان کے ساتھ ان کا پیغمبر ہے۔ اور ان کے ساتھ وہ بت ہیں جن کو وہ خدا کے سوا پوجتی تھیں۔ اور گویا کہ میں اہل دوزخ کی سزا کو اور اہل جنت کے ثواب کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ سن کر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم معرفت کو پہنچ گئے، اب اسی پر جمے رہو، (عرفت فالزم، حلیۃ الاولیا لابی نعیم، جلد اوّل)

قرآن نصیحت کے لئے ہے نہ کہ محض تلاوت کے لئے

امام احمد نے حضرت عائشہ کی روایت نقل کی ہے کہ ان کو بتایا گیا کہ کچھ لوگ رات کو قرآن پڑھتے ہیں اور رات بھر میں سارا قرآن ایک یا دو بار پڑھ ڈالتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان لوگوں نے پڑھا اور انھوں نے نہیں پڑھا۔ میں رسول صلّی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساری رات کھڑی رہتی۔ آپ سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورۃ النساء پڑھتے۔ جب بھی آپ کسی ایسی آیت سے گذرتے جس میں اللہ سے ڈرایا گیا ہے تو آپ ضرور اللہ سے دعا کرتے اور پناہ مانگتے۔ اور جب بھی آپ کسی ایسی آیت سے گذرتے جس میں بشارت ہو تو آپ ضرور اللہ سے دعا کرتے اور اس میں رغبت ظاہر کرتے (اخرج احمد عن عائشۃ رضی اللہ عنہا انہا ذکر لہا ان ناساً یقرؤن القرآن فی اللیل مرۃ او مرتین فقالت اولٰئک قرؤا ولم یقرؤا کنت اقوم مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ التمام فکان یقرأ بالبقرۃ وآل عمران والنساء فلا یمر بآیۃ فیہا تخویف الا دعا اللہ واستعاذ ولا یمر بآیۃ فیہا استبشار الا دعا اللہ ورغب الیہ)

دنیا کی تکلیفوں پر صبر کرنے سے آخرت کے گناہ معاف ہوتے ہیں

حضرت ابوبکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ آیت پڑھی من یعمل سوءً یجز بہ (جو شخص کوئی برائی کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا) اور کہا کہ اب ہمارے لئے بھلائی کی کیا صورت ہے۔ جو برائی بھی ہم نے کی ہے اس کی سزا ہم کو ملے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر، خدا تمھیں معاف کرے۔ کیا تم بیمار نہیں ہوتے۔ کیا تم کو تھکن نہیں ہوتی۔ کیا تم غمگین نہیں ہوتے۔ کیا تم کو مصیبت نہیں پیش آتی۔ کیا تم کو ٹھوکر نہیں لگتی۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ یہ سب تو پیش آتا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ گناہوں کا بدلہ دنیا میں دیا جاتا ہے (فھی ما تجزون بہ فی الدنیا، کنز العمال، جلد اول)

چھوٹوں کے جنازہ میں بھی بڑوں کو شرکت کرنا چاہئے

مدینہ میں ایک کالے رنگ کی باؤلی سی عورت تھی۔ وہ مسجد کا کوڑا صاف کیا کرتی تھی۔ اس کا انتقال ہوا تو چند لوگوں نے اس کی تدفین کر دی اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر نہ دی۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو مجھ کو اس کی اطلاع دیا کرو۔ اور آپ نے بعد کو اس کی نماز جنازہ پڑھی۔

ایک سفر

حلقۂ الرسالہ کی دعوت پر میں ۱۶ نومبر ۱۹۸۲ کی شام کو حیدر آباد سے بھوپال پہنچا اور ۱۹ نومبر کی شام کو دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔

۱۶ نومبر کو جب کہ اے پی ایکسپریس مجھے لئے ہوئے تیزی سے بھوپال کی طرف بڑھ رہی تھی، میں اپنے ملک کے بارہ میں شدید غم کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ میں جس ڈبہ میں تھا اس میں تمام پڑھے لکھے لوگ تھے اور انگریزی میں باتیں کرتے تھے۔ شیشہ بند ڈبہ میں ہم باہر کے شور سے محفوظ تھے۔ مگر اندر کے مسافر اتنے زور زور سے باتیں کر رہے تھے کہ دوسرے کیبن کی آواز بھی صاف سنائی دیتی تھیں۔ مثلاً ایک بار یہ آواز میرے کان میں آئی:

You are a senior officer

(آپ ایک سینئر افسر ہیں) ایک مرد اور عورت اپنے تین چھوٹے بچوں کے ساتھ تھے۔ ان کے خوش پوش بچے مسلسل شور برپا کئے ہوئے تھے اور اپنے کیبن سے نکل کر باہر دوڑتے تھے مگر ان کے ماں باپ کو میں نے کبھی منع کرتے نہیں سنا۔ "ایر کنڈیشنڈ کار" میں ہم مشینی شور سے محفوظ تھے۔ مگر انسانی شور کا یہ حال تھا کہ میرے لئے پڑھنا لکھنا مشکل ہوگیا۔

مجھے ۳۰ اگست ۱۹۸۲ کا واقعہ یاد آیا جب کہ میں مالٹا سے پیرس جا رہا تھا۔ ہوائی جہاز میں مجھ سے ملی ہوئی سیٹ پر دو فرانسیسی بچے بیٹھے ہوئے تھے جو مالٹا میں چھٹیاں گذار کر اپنے وطن فرانس واپس جا رہے تھے۔ یہ بچے جو بھائی بہن تھے اکثر آپس میں باتیں کرتے تھے مگر قریب ہونے کے باوجود ایک بار بھی ان کا کوئی جملہ مجھے سنائی نہیں دیا۔ میں نے جب بھی ان سے کوئی سوال کیا تو انھوں نے نہایت آہستگی اور تہذیب کے ساتھ میرے سوال کا جواب دیا۔

جس ملک میں اونچے پڑھے لکھے لوگوں کا یہ حال ہو اس کے بارہ میں کس طرح کوئی اچھی امید قائم کی جا سکتی ہے۔

بھوپال میں پہلا پروگرام ۱۷ نومبر کو ۱۱ بجے دن میں ہوا۔ یہ پروگرام صدر منزل میں بھوپال یونیورسٹی کے تحت تھا۔ جناب عزیز قریشی (چیرمین مدھیہ پردیش اسٹیٹ فنشریز ڈولپمنٹ کارپوریشن) اور ڈاکٹر آر سی شکلا (وائس چانسلر بھوپال یونیورسٹی) بحیثیت صدر اور چیف گیسٹ ڈائس پر موجود تھے۔ ڈاکٹر مسز عارفہ سمین (ہیڈ ڈپارٹمنٹ آف عربک بھوپال یونیورسٹی) نے اجتماع کی کارروائی چلائی۔ مقررہ

عنوان کے مطابق میں نے "ریلیجن اینڈ کلچر" کے بارہ میں تقریر کی۔ سرکاری عہدیدار اور غیر مسلم حضرات قابل لحاظ تعداد میں موجود تھے، اسی دن شام کو دار العلوم تاج المساجد کے طلبہ کے سامنے علم اور تعلیم کے موضوع پر خطاب کیا۔

۷ نومبر کی شام کو مغرب کے بعد اخبار ایاز کے دفتر میں اجتماع تھا۔ کافی بڑی تعداد جمع تھی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے سکریٹری جناب کشا بھاؤ ٹھاکرے (پیدائش ۱۹۲۲) بھی اجتماع میں موجود تھے۔ جن سنگھ اور آر ایس ایس سے تعلق رکھنے والے مدھیہ پردیش کے ممتاز افراد تقریباً سب کے سب جمع تھے۔ جناب کشا بھاؤ ٹھاکرے میری تقریر شروع سے آخر تک غور سے سنتے رہے۔ ان سے اظہار خیال کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے اپنی تقریر میں نہایت کھلے لفظوں میں میری تقریر کے بارہ میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ان کی تقریر کے بعض حصے ان کے اپنے الفاظ میں ٹیپ سے لے کر یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

شری کشا بھاؤ ٹھاکرے کی تقریر

آدرنیہ مولانا صاحب، آج اس کاریہ کرم میں جو بھاشن ہمارے سامنے ہوا اس سے ہم کو بڑی خوشی ہوئی۔ میں اردو جانتا نہیں لیکن ہمارے ساتھی سارنگ جی صاحب الرسالہ پڑھتے ہیں اور کہتے رہتے ہیں کہ بھائی یہ تو بڑا مانسک میگزین ہے۔ اور آج اس میگزین کے سمپادک مہودے سے تفصیل سے بات سننے کو ملی۔

واستو میں آج ساری دنیا میں ہر جگہ جھگڑے کی بات سنائی دیتی ہے۔ گھر گھر اں کی بات سنائی دیتی ہے۔ پر ایسے واتاورن میں جب اس پرکار کی تقریر سننے کو ملتی ہے تو آدمی کو پر درشن ہوتا ہے۔ آدمی کے جلے ہوئے زخم میں جب کوئی تیل لگاتا ہے تو ایک پرکار کا آنند آتا ہے، اسی پرکار کا آنند آج آیا۔ واستو میں مولانا صاحب نے جو کہا وہ تو جتنا سنتے جاؤ اتنا ہی آنند آئے گا۔ اس پرکار سننے کو بہت کم ملتا ہے لیکن جتنا بھی سنو کم ہے۔ جتنا انھوں نے کہا اس میں سے تھوڑا بھی حصہ ہم اپنی زندگی میں اتارلیں تو بہت بڑا کام ہے۔ آج اس پرکار کے سنکار دینے والے بہت کم ہیں۔ آج ہمیں اس پرکار کے ویکتیوں کا بھاشن سننے کو ملا۔ بہت خوشی ہوئی۔ میں اس سے بہت خوش ہوں کہ مولانا صاحب نے ہمارے بیچ میں اپنا سمے بتایا۔ میں اس کا بہت آبھاری ہوں اور میں چاہوں گا کہ ہمیں بار بار یہ بات سننے کو ملے۔

۱۸ نومبر کی شام کو ٹی ٹی نگر کی مسجد میں نماز مغرب کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ اس میں زیادہ تر

سروس کرنے والے لوگ شریک ہوئے۔ اس موقع پر میں نے آخرت کے بارہ میں تقریر کی۔ اسی دن ایک اور اجتماع ایک صاحب کے مکان پر ہوا۔ اس اجتماع میں میں نے اپنے حالیہ سفر (ایشیا یورپ اور افریقہ) سے متعلق اپنے تاثرات اور واقعات بیان کئے۔

۱۹ نومبر کی شام کو مسجد قدسیہ بیگم میں نماز مغرب کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ تعلیم یافتہ افراد کی اچھی تعداد اکٹھا ہو گئی تھی۔ کچھ غیر مسلم حضرات بھی شریک تھے۔ میں نے اسلام کی تعلیمات کے موضوع پر تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کی۔ بعد کو لوگوں نے غیر معمولی تاثرات کا اظہار کیا۔

بھوپال کی تقریریں شاید الرسالہ میں شائع نہ ہو سکیں۔ تاہم ان سب کا ٹیپ بھوپال والوں کے پاس موجود ہے۔ تمام تقریریں ٹیپ کی مدد سے دوبارہ سنی جا سکتی ہیں۔

بھوپال کا سنجیدہ طبقہ اہتمام کے ساتھ الرسالہ کا مطالعہ کر رہا ہے۔ ایک صاحب جو گورنمنٹ میں سکریٹری کے عہدہ پر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ اس نے میری لڑکی کو الحاد سے بچایا ہے۔ اس خاتون نے انگریزی سے ایم اے کیا ہے اور آج کل وہ ڈاکٹریٹ کر رہی ہیں وہ ایک مدت تک روسیوں کے ساتھ رہی ہیں اور روسی زبان بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔

یہ خاتون کمیونسٹ لٹریچر پڑھ کر مذہب سے بیزار ہو گئی تھیں۔ ان کے والدین نے ان کو اسلامی لٹریچر پڑھانے کی کوشش کی مگر انھوں نے دل چسپی نہ لی۔ اس قسم کی کتابوں کو دیکھ وہ الگ رکھ دیتی تھیں۔ اس کے بعد ان کو الرسالہ پڑھنے کے لئے دیا گیا۔ اس سے انھیں دل چسپی ہوئی۔ اب وہ الرسالہ کو باقاعدہ طور پر پڑھتی ہیں۔ انھوں نے اپنے والد سے الرسالہ کے بارے میں اپنا تاثر ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ مجھ کو اپیل کرتا ہے۔

This appeals to me

۱۸ نومبر کو ایک ممتاز شخصیت کے مکان پر خصوصی نشست ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک تھے۔ ایک صاحب نے کہا : برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ قدیم زمانہ میں ہزاروں سال تک مذہب کا دور تھا۔ مگر مذہب کے دور میں انسان کچھ ترقی نہ کر سکا۔ انسان کو جو کچھ ملا ہے سائنس کے دور میں ملا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات ایک تبدیلی کے ساتھ درست ہے۔ قدیم زمانہ میں غلبہ مذہب کا نہیں بلکہ مشرکانہ مذہب کا تھا۔ شرک تمام چیزوں کو معبود کا درجہ دے کر تحقیق کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ توحید کا انقلاب آیا تو اس نے چیزوں کو معبود کے مقام سے ہٹا دیا۔ اس کے بعد انسان نے اشیاء کی تحقیق شروع کی۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے وہ انقلاب آیا جس کو سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

ایک آیت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے ـــــــ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کا گمان ہے کہ وہ قرآن پر اور خدا کی دوسری کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کرائیں۔ حالانکہ انھیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انھیں بھٹکا کر بہت دور کر دینا چاہتا ہے۔ (النساء ۶۰)

کچھ لوگ اس آیت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ: "یہاں صریح طور پر طاغوت سے مراد وہ حاکم ہے جو قانون الٰہی کے سوا دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو۔ اور وہ نظام عدالت جو نہ تو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔ لہٰذا یہ آیت اس معنی میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت طاغوت کی حیثیت رکھتی ہو اس کے پاس اپنے معاملات فیصلہ کے لئے لے جانا ایمان کے منافی ہے۔ خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔" اس تشریح کے بعد فوراً یہ لوگ دوسرا نتیجہ یہ نکال لیتے ہیں کہ مسلمان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مشرکانہ اور کافرانہ نظام حاکمیت کو توڑے اور اسلام کی بنیاد پر حاکمیت کا نظام قائم کرے تاکہ اس کے لئے اپنے معاملات میں خدائی قانون کے مطابق فیصلہ لینا ممکن ہو سکے۔

اس قسم کے "انقلابی" نظریہ کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ قرآن کے ایک سادہ اور عام حکم کو غلط طور پر سیاسی معنی پہنانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے انفرادی دینی تقاضوں کو بیان کر رہی ہے نہ کہ مذکورہ معنی میں اجتماعی انقلاب کا سیاسی سبق دے رہی ہے۔ ہندستان کے پس منظر میں اس آیت کو نہایت آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔

آج ہر جگہ یہ صورت حال ہے کہ مسلمانوں کے درمیان آپسی جھگڑے برپا ہیں۔ کوئی بستی اور کوئی محلہ اس قسم کے باہمی جھگڑوں سے خالی نہیں ہے۔ ان جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے مسلمانوں کا طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر ایک پہلی فرصت میں اپنے جھگڑے کو ملک کی عدالت میں لے جاتا ہے جس کو وہ اپنے عقیدے کے مطابق کافر اور مشرک عدالت سمجھتا ہے۔ مگر اس سے بے پرواہ ہو کر ہر ایک انھیں عدالت کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اور اس میں اپنے وقت اور اپنے مال کا بہترین حصہ خرچ کر رہا ہے۔

قرآن کی مذکورہ آیت اسی روش کے خلاف مسلمانوں کو تنبیہ کر رہی ہے۔ اس میں ان لوگوں پر نکیر ہے جو خدا کی کتاب کے آگے نہیں جھکتے البتہ طاقت کے آگے جھک جاتے ہیں خواہ وہ طاغوت ہی کیوں نہ ہو۔

October 1983

AL-RISALA

Islamic Monthly

Submission to God
is the only religion
for both
Man and the Universe

Published by The Islamic Centre, Delhi

ایجنسی: ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے کافی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

AL-RISALA MONTHLY
Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)
Telephone : 232231, 526851

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدّین خاں کے قلم سے

۱ - تذکیر القرآن جلد اوّل ہدیہ ۵۰/-
۲ - الاسلام ۱۵/-
۳ - مذہب اور جدید چیلنج ۲۰/-
۴ - ظہورِ اسلام ۲۰/-
۵ - احیاءِ اسلام ۱۲/-
۶ - پیغمبرِ انقلاب ۲۰/-
۷ - دین کیا ہے ۲/-
۸ - قرآن کا مطلوب انسان ۵/-
۹ - تجدیدِ دین ۳/-
۱۰ - اسلام دینِ فطرت ۳/-
۱۱ - تعمیرِ ملّت ۳/-
۱۲ - تاریخ کا سبق ۳/-
۱۳ - مذہب اور سائنس ۵/-
۱۴ - عقلیاتِ اسلام ۳/-
۱۵ - فسادات کا مسئلہ ۲/-
۱۶ - انسان اپنے آپ کو پہچان ۱/-
۱۷ - تعارفِ اسلام ۲/۵۰
۱۸ - اسلام پندرھویں صدی میں ۲/-
۱۹ - راہیں بند نہیں ۳/-
۲۰ - ایمانی طاقت ۳/-
۲۱ - اتحادِ ملّت ۳/-
۲۲ - سبق آموز واقعات ۳/-
۲۳ - زلزلۂ قیامت ۴/-
۲۴ - حقیقت کی تلاش ۳/-
۲۵ - پیغمبرِ اسلام ۲/-
۲۶ - منزل کی طرف ۶/-
۲۷ - حقیقتِ حج (زیرِ طبع)
۲۸ - Mohammad The Ideal Character 3/-

تعارفی سٹ

۲۹ - سچّا راستہ ۱/-
۳۰ - دینی تعلیم ۳/-
۳۱ - حیاتِ طیّبہ -/۵۰
۳۲ - باغِ جنّت
۳۳ - نارِ جہنّم

مکتبہ الرسالہ □ جمعیّۃ بلڈنگ □ قاسم جان اسٹریٹ □